ISSN : 2582-5658 یو۔جی۔سی سے منظور شدہ

غالب نامہ

ششماہی

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

خليل مامون

1948-2024

ششماہی

غالب نامہ

مجلسِ مشاورت

پروفیسر عتیق اللہ

پروفیسر سرور الہدیٰ

ششماہی

غالب نامہ

اُردو میں علمی اور تحقیقی رفتار کا آئینہ

مدیر اعلا

پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی

مدیر

ڈاکٹر ادریس احمد

نائب مدیر

ڈاکٹر مخضر رضا

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

یو جی سی سے منظور شدہ ریسرچ اور ریفرڈ جرنل

ششماہی غالب نامہ نئی دہلی

"Gifted"

جنوری تا جون ۲۰۲۴

جلد نمبر ۷ ____________ شمارہ نمبر ۱

ISSN : 2582-5658

قیمت : 250 روپے

ناشر و طابع : ڈاکٹر ادریس احمد

"Fakhruddin Ali Ahmed Research Library"
Ghalib Institute, Aiwan-e-Ghalib Marg,
New Delhi-110002

کمپوزنگ : محمد عمر کیرانوی

مطبوعہ : عزیز پرنٹنگ پریس

Printed and published by Dr. Idris Ahmad on behalf of the Ghalib Institute, Aiwan-e-Ghalib Marg, New Delhi 11002 and printed at the Aziz Printing Press,

Katra Mehar Parwar, Kucha Chellan, Daryaganj, New Delhi 110002.

Editor: Dr. Idris Ahmad, email: ghalibinstitute@gmail.com

Ph. : 23232583-23236518

"Accession Number" 21151

غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ نئی دہلی-۲

فہرست

1	پیش لفظ	7
2	ہربنس مکھیا	9
3	عتیق اللہ	14
4	انیس اشفاق	29
5	جینت پرمار	34
6	خلیل مامون	39
7	رشید افروز	51
8	نصیر احمد ناصر	63
9	کاظم جرولی	72
10	شہپر رسول	77
11	عین تابش	86
12	مہتاب حیدر نقوی	95
13	عالم خورشید	101
14	احمد محفوظ	103
15	اے نصیب خاں	107
16	جمال اویسی	114
17	معراج رعنا	118
18	سرور الہدیٰ	120
19	سلیم سہیل	129
20	سید راغب اختر	132

21 معید رشیدی 134

22 سالم سلیم 138

23 فیضان الحق 143

24 کیدارناتھ سنگھ/سرورالہدیٰ 147

25 نیل منی پھوکن/سرورالہدیٰ 162

26 جوشش عظیم آبادی 169

27 رند لکھنوی 172

28 غالب رہ روِ تفتہ (ڈرامہ) نیر مسعود 175

29 زوال پرستی پر مذاکرہ ترجمہ وتعارف: شمیم حنفی 190

30 پروف ریڈر کی بیوی ایس راما کرشنن/عبدالسمیع 206

31 تصفیہ باما/عبدالسمیع 211

32 ایرخ فرام اور انسانی ذات کا ارتقا قاضی جاوید 220

33 آزادی کا مسئلہ ایرخ فروم/محمد سلیم الرحمٰن 226

34 اسطور کیا ہے کیرن آرمسٹرانگ/ناصر عباس نیر 239

35 درد کی رات گزر جائے تو سو جاؤں گا سرورالہدیٰ 246
(خلیل مامون کی یاد میں)

سرگرمیاں مشتاق احمد 253

پیش لفظ

یہ پہلا موقع ہے جب 'غالب نامہ' کا کوئی شمارہ تخلیق اور ترجمے کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔ ترجمہ بھی تخلیق ہے لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ شمارہ بنیادی طور پر تخلیقی ادب سے متعلق ہے۔ اس میں تین ترجمے بھی ہیں جو براہ راست تخلیق سے متعلق تو نہیں مگر ان کے مسائل تخلیق اور تخلیق کار سے الگ نہیں ہیں۔ اس لیے یہ ضروری سمجھا گیا کہ انہیں بھی اس شمارے میں شامل کر لیا جائے۔ 'غالب نامہ' کا بنیادی مزاج علمی اور تحقیقی رہا ہے۔ اسی لیے بعض حضرات کا اصرار تھا کہ اسے اپنے مزاج کے ساتھ ہی رہنا چاہیے۔ یہ دلیل اتنی مستحکم ہے کہ اسے رد کرنا مشکل ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب کہ علمی اور ادبی دنیا بڑی حد تک بڑی شخصیات سے دیکھتے دیکھتے خالی ہو گئی ہے، یہ سوال غلط نہیں کہ موجودہ صورتحال کس طرح اور کیونکر ان شخصیات کے رخصت ہو جانے کی تلافی کرے گی۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ہر زمانے میں بڑی شخصیات جب رخصت ہوتی ہیں تو یہ کہا جاتا ہے کہ اب ان کی جگہوں کا پر ہونا مشکل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جو جگہ خالی ہوتی ہے وہ بڑی حد تک خالی ہی رہتی ہے۔ افسوس کا مقام وہ ہوتا ہے جبکہ معاشرہ اس احساس سے خالی ہو جائے کہ اس نے کیا کھویا ہے اور کیا پایا ہے۔ کوئی معاشرہ کب تک صرف اپنے بارے میں سوچ کر خوش ہوتا رہے گا۔ یہ علمی و ادبی معاشرہ کسی ایک فرد سے بنتا نہیں ہے مگر کبھی ایک فرد پورا معاشرہ بن جاتا ہے۔ یہ بھی ایک طرح کی محرومی ہے کہ کوئی معاشرے کو اپنی ہی ذات کی طرف بلائے اور اپنی ہی ذات کی عظمت کا احساس دلانا چاہے۔ تخلیق ہو یا ادب کی کوئی بھی صنف و صورت ادبی معاشرہ انہی سے پہچانا جاتا ہے، جو صرف تخلیقی ادب کو کسی معاشرے کی پہچان بتاتے ہیں اس کا اپنا ایک

جواز ہے مگر اس طرح بھی سوچنا چاہیے کہ ادب کے نام پر کوئی بھی سرگرمی تخلیقی ادب کو کسی نہ کسی طور پر تقویت پہنچاتی ہے۔ کسی ایک صنف کو دوسری صف سے بالکل الگ کر کے دیکھنا ہماری ضرورت ہوسکتی ہے مگر ایک صنف دوسری صنف کے ساتھ مل کر کس طرح اپنے وقت کی نمائندگی کرتی ہے اس کا احساس بھی ضروری ہے۔ تخلیقی ادب صرف شاعری نہیں ہے۔ لیکن کیا کیا جائے ابھی بھی تخلیقی ادب کے ساتھ شاعری کا خیال کچھ زیادہ آتا ہے۔ پرانے ادبی رسالوں میں ناول قسط وار شائع ہوا کرتا تھا اب بھی کہیں کہیں کسی رسالے میں ناول کی قسطیں شائع ہوتی ہیں۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ ناول کی اشاعت سے پہلے لوگوں کے اذہان ناول کے کتابی روپ کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ کہانیاں اپنے عہد سے زیادہ متعلق سمجھی جاتی ہیں مگر اس کا دارومدار بھی کہانی کار کی تخلیقی ترجیحات پر ہے۔ معاصر ادب کا کوئی انتخاب یا نمبر مکمل طور پر معاصر نہیں ہوسکتا۔ اس میں ہمیشہ اس کی گنجائش باقی رہتی ہے کہ کسی کو شامل کیا جائے اور یہ بھی بتانا پڑتا ہے کہ کیوں کر کسی ادیب کی تحریریں اپنے عہد کے ساتھ ساتھ ماضی کا شعور بھی رکھتی ہیں اور ان میں مستقبل کے امکانات بھی پوشیدہ ہوتے ہیں۔ یہ بھی فنکار کا اعزاز ہے کہ وہ کسی زمانے میں دوسرے زمانوں کو اپنی طرف متوجہ کر لے۔ ایسا اس وقت ہوتا ہے جب کسی تخلیق کار کے یہاں کلاسکی شان پیدا ہو جائے اور تخلیقات خود ہی یہ تاثر پیش کرنے لگیں کہ وہ جتنی معاصر ہیں اس سے کم آفاقی نہیں۔

'غالب نامہ' کا یہ شمارہ پروفیسر سرورالہدیٰ کی نگرانی میں مرتب ہوا ہے۔ اس شمارے کی تیاری میں انھوں نے جو مشقت برداشت کی اس کے لیے شکریے کی رسمیات معمولی سی نظر آتی ہیں البتہ اعتراف حقیقت کے طور پر ان کا شکریہ لازمی ہے۔

صدیق الرحمٰن قدوائی

ہربنس مکھیا

نظمیں

(1)

لکیریں

ہم اپنے ماضی میں
دو زندگیاں جینے کے عادی ہو گئے تھے
اپنی اپنی اور ایک دوسرے کی زندگی
ان کے بیچ چند دھندلی لکیریں کھینچی تھیں
یہ لکیریں کبھی
ایک جگہ نہیں ٹھہریں
ان کے رنگ، روپ، گہرائی
دونوں زندگیوں کے حدود
برابر بدلتے رہتے تھے
سنگیت کے سروں کی طرح
پھر ایک دن ہم نے
اپنی اپنی لکیروں کو
الگ الگ کر غور سے دیکھا
تو محسوس ہوا

کہ ان میں
تمھاری اور میری
انفرادی فطرت کی کوئی لکیر نہیں ہے
ہم نے ان لکیروں کو
سیدھا کھڑا ہونا سکھایا
انھیں مضبوط پیر دیے
اور ذرا ہٹ کر
انہیں فخر سے دیکھا
ہمارے ماضی میں جہاں
اوراق مصور تھے
وہاں آج
بس لکیروں کا اک ڈھیر ہے

○

(2)

نظم کے روبرو مورخ

(کے سچیدہ نندن کی نظم گاندھی اور شاعری سے متاثر ہو کر)

ایک پیشہ ور مورخ
کندھوں پر دنیا کو سنوارنے کی گٹھری باندھے
سانحات تاریخ میں نہاں
معنی کی تلاش میں
دن بھر جاہلیت سے جنگ میں مبتلا

رات بھر علم کی روشنی میں ڈوبا
وقت کے فاصلے طے کرتا
اچانک کسی دھندلی شام
ایک نظم کے روبرو کھڑا ہو
نظم کا سانولا سلونا بدن
جس کے دمکتے رنگوں کو سورج کے کرنیں چھوتیں
تو رات نکھر آتی
جس کی اداسی کی برف میں پھول کھلتے
جس سے اٹھکیلیاں کرنے
خدا زمین پر اتراتا
نظم کے حسن سے چکا چوندھ
ہوش و حواس کھوئے
مورّخ گھر لوٹ آیا
جہاں اب گھُپ اندھیرا تھا
اندھیرے کی پرتوں سے نظم
چھپ چھپ کر اسے دیکھ مسکراتی رہی

○

(3)

وقت

میں صدیوں کی تاریخ
مٹھی میں بند کیے
وقت کی تلاش میں نکلا ہوں

زندگی کے ہر موڑ پر میں نے
وقت کو ڈھونڈا
حق کی ہر صلیب پر
جہاں کسی باغی کے خون کے داغ
اب تک موجود ہیں
زہر کے ہر پیالے میں
جہاں کسی سوال کرنے والے انسان کے
لبوں کے نشان باقی ہیں
ہر عاشق کی قبر پر
جس میں انگنت ارمان دفن ہیں
ہر جگہ میں نے وقت کی تلاش کی
جو مجھے بتا سکے
کہ بغاوت کا انجام موت کیوں ہوتا ہے
سوال پوچھنا گناہ کیوں ہوتا ہے
عشق ہمیشہ ناکام کیوں ہوتا ہے

○

(4)

میری ایک اکیلی ہندی کویتا

کل سانجھ کے سایے میں تم آئے
اور آج لگتا ہے جیسے

پھولوں کے ہر رنگ میں
میرا ہی وِستار ہے

ہر درشٹی پتھ پر تمھاری چھایایں
ہر شو اس میں تمھارے سروں کا آبھاس
ہر بھاؤ میں نہت تم
انایاس
کہ جتنا پیار تم کو دے سکا ہوں
ان شنوں میں
اتنا کل ملا کر
کیا کسی کو دے سکوں گا
زندگی بھر

○

عتیق اللہ

غزلیں

(1)

یہ نہیں ہوتا اگر ہوتا تو کیا وہ نہیں ہوتا مگر ہوتا تو کیا
کب ہوا اس پر کبھی میں منحصر اور اسی پر منحصر ہوتا تو کیا
میں کسی پر منحصر ہوتا نہیں اور کسی پر منحصر ہوتا تو کیا
یوں تو ہوتا ہی نہیں کوئی اثر اور اگر کوئی اثر ہوتا تو کیا
رونما جو ہورہا تھا اُس طرف اور ویسا ہی اِدھر ہوتا تو کیا
شہر تو مسمار سارا ہوگیا اور سلامت میرا گھر ہوتا تو کیا
تو بھی ہوتا اور کچھ ہوتا تو کیوں اور کچھ میں بھی دِگر ہوتا تو کیا
عمر بھر میں باخبر ہوتا تو کیوں عمر ساری بے خبر ہوتا تو کیا
شر کے اندر خیر بھی تھا کچھ مگر خیر کے اندر ہی شر ہوتا تو کیا
پاس ہی ہوتی اگر منزل تو کیوں راستہ بھی بے خطر ہوتا تو کیا
بے یقینی اور یقیں میں فرق کچھ گو نہیں ہے اور اگر ہوتا تو کیا

میں بھی اپنی راہ پر ہوتا تو کیوں
''یوں نہیں پریوں اگر ہوتا تو کیا''

○

(2)

اک پیکر تو ہم سا بنایا
پھر اس کا سر تا پا بنایا

کچھ بھی کسی صورت نہ بنا تو
جسم سے پہلے سایہ بنایا

منزل سب سے پہلے بنائی
پھر رستوں کا نقشہ بنایا

اک دنیا کچھ ایسی بنائی
ملک نیا اِک ویسا بنایا

پہلے بنائے دونوں کنارے
اور پھر کوئی دریا بنایا

دن گوندھے اور راتیں چھانیں
اک عالم پھر ایسا بنایا

بھول گئے سب اس کا سراپا
جب ہم نے وہ چہرہ بنایا

افق افق خالی خالی تھا
سو اک چاند اک تارہ بنایا

○

(3)

اور پھر ایسا کبھی ہوگا تو دیکھا جائے گا
زخم یہ گہرا کبھی ہوگا تو دیکھا جائے گا

ہولنا کی ایسی پھر ہوگی تو دیکھی جائے گی
ایسا سناٹا کبھی ہوگا تو دیکھا جائے گا

راستے کچھ تو کھلے ہیں اور بال و پر بھی ہیں
بند ہر رستہ کبھی ہوگا تو دیکھا جائے گا

جو ہوا ہے اتفاقاً ہی ہوا ہوگا ابھی
اب یہ دوبارہ کبھی ہوگا تو دیکھا جائے گا

خیر سے اس وقت وہ باب جہنم بند ہے
اتفاقاً وا کبھی ہوگا تو دیکھا جائے گا

ہم پہ دامانِ زمیں کیوں ہو رہا ہے روز تنگ
اِتنا ہے اُتنا کبھی ہوگا تو دیکھا جائے گا

بس یہی کہنے میں اپنی عافیت ہے ابھی
ایسا ہی خطرا کبھی ہوگا تو دیکھا جائے

(4)

میں طول دیتا نہیں مختصر بتاؤں گا
پھر اس کے بعد ہوا کیا اثر بتاؤں گا

جو زخم سینے میں پیوست ہیں کچھ اور ہی ہیں
میں اپنی کھال تجھے کھینچ کر بتاؤں گا

بڑھا چڑھا کے کوئی بات میں نہیں کرتا
اڑان بھر کے میں بے بال و پر بتاؤں گا

اب اس کے بعد کیا اقدام کرنے والا ہوں
خطر بہت ہے مگر بے خطر بتاؤں گا

ہمارے سامنے یہ خودسری نہیں اچھی
کہاں پہ جا کے جھکا تیرا سر بتاؤں گا

کچھ ایسی باتیں میں تم کو سنانے والا ہوں
تمھیں یقین نہ آئے گا پر بتاؤں گا

○

(5)

وصالِ یار کا امکاں اگر نہیں ہے تو
یہ شب گزارنا آساں اگر نہیں ہے تو

فصیلِ شہر سے باہر نکل تو آئے ہیں
یہ دشت اس قدر ویراں اگر نہیں ہے تو

ذرا یہ دامنِ صدچاک خالی خالی دیکھ
ہمارا چاک گریباں اگر نہیں ہے تو

یہ کم نہیں ہے کہ پیروں تلے زمین بھی ہے
بہت سا ساز اور ساماں اگر نہیں ہے تو

ہتھیلیوں پہ کوئی شئے نظر تو آتی ہے
ہے پھر وہ کون سی شئے جاں اگر نہیں ہے تو

ہر اک ہنر اسے آتا ہے بچ نکلنے کا
کوئی بھی زخم نمایاں اگر نہیں ہے تو

نظمیں

(1)

میں زندہ رہوں گا

اپنی کھڑکی سے میں دیکھتا رہتا ہوں
ہر روز ہر صبح اس شخص کو اس گلی سے گزرتا ہوا
اس کے کاندھوں سے لٹکا ہوا ایک جھولا جسے اس نے برسوں سے
بدلا نہیں ہے اور شاید وہ خالی ہی رہتا ہے اکثر ہواؤں کے ہلکے سے
جھونکے سے لہرانے لگتا ہے۔ جیسے ہو پرچم کوئی

پہلے میں دیکھتا تھا، بہت تیز اور لمبے ڈگ بھر کے چلتا تھا۔ منٹوں میں ساری گلی پار کر لیتا تھا۔ قد بھی لمبا تھا، سارسوں کی طرح سر اٹھا کر اپنی سوچوں میں ڈوبا ہوا ایسا لگتا تھا جیسے گلی میں وہی وہ ہے اور کوئی نہیں ہے نہ کوئی پڑوسی نہ سایہ کسی کا اور نہ کوئی مسافر جو بھٹکتے بھٹکتے ادھر آ گیا ہو۔ یوں تو وہ ایک ہی شخص تھا مگر اس سے ساری گلی ایسی آباد تھی جیسے ہزاروں میں وہ بٹ گیا ہو۔

بارہا میں نے سوچا کہ ایسی بھی کیا بات ہے اور ایسی کشش کیا ہے اُس میں جو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اس نے کاندھے پہ جھولے کو کیوں رکھا ہے۔ جب بھی دیکھا ہے خالی ہی دیکھا ہے۔ صبح جاتا ہے لیکن وہ کب لوٹتا ہے یہ بھی اک راز ہے۔ سوچتے سوچتے وقت کٹتا چلا جا رہا تھا اور جس وقت اس کی کمر جھک گئی تھی، اور ہاتھوں میں لاٹھی بھی رکھنے لگا تھا آہستہ آہستہ چلتا تھا۔ سوچوں میں گم، خود سے باتیں بناتا ہوا، اپنی گردن ہلاتا ہوا، اپنا بوسیدہ جھولا سنبھالے ہوئے سر جھکائے ہوئے صبح کو دیر سے بھی نکلنے لگا تھا اور پھر جلد ہی لوٹ جاتا تھا۔

میں نے سوچا کئی بار سوچا، سوچتے سوچتے کٹ گیا اک زمانہ کہ اس سے ملوں اور کچھ اس کے بارے

میں پوچھوں اور کچھ اپنے بارے میں اس کو بتاؤں کہ میں کتنے برسوں سے پہچانتا ہوں اسے۔ وہ بھی اب وہ نہیں ہے جو پہلے کبھی تھا اور ممکن ہے میں بھی اسی طرح یا پھر اس سے زیادہ ہی میری کمر جھک گئی ہے۔ اپنی اک ایک ہڈی کی گنتی بھی میں کر چکا ہوں جیسے کوئی شے ہو اور رکھ دیا ہو جسے طاق دیوار پر پھر بھی جب سے ارادہ کیا ہے کہ اس بار جب وہ گلی میں نظر آئے گا اس کو سیٹی بجا کر اشارہ کروں گا کہ ٹھہرو مجھے تم سے ملنا ہے بس میں ابھی آ رہا ہوں مگر دن گزرتے گئے، سال ہونے کو آیا وہ اس روز ہی سے نظر بھی نہ آیا کہ میں اس سے ملتا، خیریت پوچھتا۔ وہ میرا پرانا شناسا تھا کس سے پتہ اس کا پوچھوں۔ کوئی نام اس کا بھی ہوگا۔ کسی نے اگر مجھ سے پوچھا تو نام اور پتہ کیا بتاؤں گا اس کو۔ عین ممکن ہے وہ پھنس گیا ہو کسی عارضے میں۔ غنیمت ہے بیمار ہو۔ کاش! ایسا ہی ہو، ایسا ہوا تو وہ اک دن ضرور آئے گا۔ یہ گلی پھر سے آباد ہوگی۔ کتنی سنسان لگتی ہے اس کے بغیر۔ راہ تکتا رہوں گا میں اس کی اور جب تک کہ میں منتظر ہوں میں زندہ رہوں گا، وہ زندہ رکھے گا مجھے، میں زندہ رہوں گا

○

(2)

گوشت پوست کا نیا روبوٹ

مجھے محسوس ہوتا ہے
تمھیں محسوس ہوتا ہے
زیادہ اور کچھ کم
سبھی محسوس کرتے ہیں
مگر محسوس کرنا ہے جسے
اسے کچھ بھی
کبھی محسوس ہوتا ہی نہیں

رات دن اس سے شکایت کرنے سے

اب باز بھی آؤ

دکھا کر زخم اپنے

کیوں نمائش کر رہے ہو

نمائش کرنے کی عادت سی تم کو ہوگئی ہے

شکایت پر شکایت کرنے سے تسکین ہوتی ہے

کچھ نہ کچھ خیرات تم کو بھی ملے گی

اسے اچھی طرح معلوم ہے

کس کو کتنا بانٹنا ہے

تمھیں بھی اپنے حصے کا یقیناً کچھ ملے گا

وہ اندھا ہے نہ بہرا ہے

وہ سب سنتا ہے

بہت کچھ ہم جسے سنتے نہیں ہیں

وہ دیکھے اِس طرف یا اس طرف

چاروں طرف وہ دیکھتا ہے

اس کی گردن گھومتی رہتی ہے چرخی کی طرح

جیسے گوشت اور ہڈی کا بنا

روبوٹ ہو کوئی

○

"Accession Number"
.....211.56.....

(3)

حمایت خاں

(شاد عارفی کی نذر)

حمایت خاں! چلو، چلتے ہیں، جا کر دیکھتے ہیں
اُس طرف یہ شور کیسا ہے
''عزیزم! یہ تو ہر دن ہوتا رہتا ہے
نیا کچھ بھی نہیں ہے
ابھی تو تم ہی دیکھ آؤ
مجھے جلدی ہے
میں آتا ہوں ابھی گھر سے
یہ بریانی کی تھیلی دے کر آتا ہوں
ابھی یہ گرم ہے
ہے سب کو انتظار اس کا
یہ لپ اسٹک اور یہ پرفیوم کی شیشی
جو عنبر نے منگائی تھی
یہ چیزیں دے کے بس آتا ہوں
تم ہو آؤ''

''حمایت خاں! مگر پہلے چلو چلتے ہیں جا کر دیکھتے ہیں
یہ ممکن ہے
ہماری کچھ مدد درکار ہو ان کو
یہ آوازوں پہ آوازیں سنائی دے رہی ہیں نا!
ان آوازوں کی رنگت دیکھتے ہو
سرخ سی کیوں ہے

ان آوازوں کے اندر بھی تو کتنی اور آوازیں ہیں
ان کی گونج سنتے ہو؟
کتنا درد کتنا کرب ہے ان میں
چلو، چلتے ہیں جا کر دیکھتے ہیں

''عزیزم! تم چلو
ہوا کی طرح بس جاتا ہوں
اور فوراً ہی آتا ہوں
نہاری کا مسالہ، گوشت، دھنیا اور مرچیں
دے کے آتا ہوں
تمھیں تو سب پتہ ہے
میری بیوی میں غصہ کس قدر ہے
اسے سمجھانا بہت مشکل ہے
مجھے ہلکان کر دے گی
اور گزارا کرنا ہوگا
کئی دن تک ہمیں ہوٹل کے کھانے پر
بہت بے صبر ہے ظالم!
عزیزم! دیر کیوں کرتے ہو
جاؤ اور دیکھو
میں ابھی بس دو منٹ میں ہو کے آتا ہوں
ابھی بس ہو کے آتا ہوں''

حمایت خاں!

حمایت خاں!

حمایت خاں!

○

(4)

ڈوبتی ہوئی لڑکی پر رثائیہ نظم

جب وہ ڈوب گئی اور (اندر اور اندر) پانیوں میں اترتی گئی
پانی کی درزوں نے، شکل لے لی تھی بڑی ندیوں کی
آسمانی نادر ہیرا (سورج) دکھائی دے رہا تھا بہت شاندار
گویا لاشے کو ڈھارس دینے کے درپے تھا وہ
گہرے پانی کی تلچھٹ کے جھاڑ جھنکاڑ اور کائی نے لپیٹ لیا تھا اسے
تب وہ دھیرے دھیرے، بہت بھاری اور سرد ہوتی چلی گئی
اس کے پیروں کو چھو کر نکل رہی تھیں مچھلیاں
پودوں اور جانوروں کے چنگل میں پھنسی ہوئی تھی وہ
اس کے آخری سفر کے دوران
شام کا وقت تھا اور آسمان جیسے گھر گیا تھا دھوئیں سے
اور رات ستاروں کی ٹمٹماتی روشنی کے ساتھ وارد ہونے پر تھی
لیکن روشنی وقت سے پہلے ہی نمودار ہو چکی تھی
اس کے لیے بھی شام اور صبح میں کوئی فرق نہیں ہوگا
جب اس کا زرد بدن آہستہ آہستہ گلتا جا رہا تھا
خدا نے بتدریج پہنچایا تھا اسے اس حالت تک
پہلے اس کا چہرہ، پھر اس کے دست و باز و اور آخر میں اس کے بال
اور پھر بہت سے مُرداروں کے بیچ میں بدل گئی تھی وہ سڑے ہوئے گوشت کے پیکر میں

— برتول بریخت

○

(5)

نہیں کچھ نہیں تھا

''نہیں کچھ نہیں تھا، (صرف) پانی تھا، اور کوئی نہیں''
تو کیا پانی کچھ نہیں ہوتا؟''
''نہیں 'وہاں' کچھ نہیں تھا (ہاں کوئی) پھول تھا''
''تو وہاں کچھ نہیں تھا'' کیا پھول کچھ نہیں ہوتا

''وہاں کچھ نہیں ہے (ہاں صرف) ہوا تھی''
''تو کیا کوئی نہیں (تھا)''
''کیا ہَوا کچھ نہیں ہوتی؟''
''نہیں، صرف التباس (تھا)''
''تو وہاں کچھ نہیں ہے؟ اور (کیا) التباس کچھ نہیں ہوتا؟
— ژواں ریماں جیمینز

○

(6)

کرفیو

تو کیا ہوا؟ دروازے پر محافظ مامور تھے
تو کیا ہوا؟ ہم گھروں کے اندر بند تھے
تو کیا ہوا؟ گلی کا راستہ بند کر دیا گیا تھا
تو کیا ہوا؟ بستی ملیامیٹ کر دی گئی تھی
تو کیا ہوا؟ لوگ قحط کے شکار تھے

تو کیا ہوا؟ ہمارے اسلحہ چھین لیے گئے تھے
تو کیا ہوا؟ رات تھک کے چور تھی
تو کیا ہوا؟ رات جنگ ہار چکی تھی
تو کیا ہوا؟ ہمیں ایک دوسرے سے محبت تھی
—پال ایلوار

○

(7)

میں نے تمھیں نہیں دیکھا

نہیں دیکھا میں نے تمھیں (لیکن) میں بخوبی جانتا ہوں
کہ تم یہیں (کہیں) ہو،
اینٹوں اور سیمنٹ کی بنی ہوئی
کمزور دیوار کے پیچھے
میری آواز جہاں تک پہنچتی ہے اُن حدود تک
تو کیا میں تمھیں آواز دوں
میں آواز نہیں دوں گا
(کیونکہ مجھے اطمینان ہے کہ تم موجود ہو)
میں تمھیں کل پکاروں گا
جب تمھیں دیر تک نہیں دیکھ پاؤں گا
میں قیاس کروں گا کہ تم ہمیشہ یہاں
میرے نزدیک ہو
اور آج اتنا ہی کافی ہے

کہ گذشتہ کل میں نے تمھیں نہیں پکارا
(ہاں) آئندہ کل جب تم وہاں (نہیں) ہوگی
ہواؤں، آسمانوں اور برسوں کی بنی ہوئی
اُس بودی دیوار کے پیچھے
(جو نہیں ہوگی اینٹوں اور سیمنٹ کی بنی ہوئی اور میں تمھیں
پکاروں گا یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم نہیں ہوگی، تم نہیں ہو)
(وضاحت: عتیق اللہ)

—پیڈرو سیلیناس

○

(8)

نوحہ

وہ میری ماں کی خادمائیں لمبے قدوں والی، پرکشش دوشیزائیں
اے! ہماری حیرتناک آنکھوں کے پپوٹے
اے! جو اپنی طرف کھینچتی ہیں
اے! جو ہر شئے کے لیے کشش آور ہیں۔ میں گاتا ہوں کہ یہ لمحہ بہت عظیم ہے
ہر ذی روح کو دعوت دینے والا، بہت حسین اور مہربان
اے! میرے سب سے خاص بسیار خور پھولوں کے گچھے، سرخ سرخ پتوں کے درمیان (جو تیار رہتے ہیں) میرے تمام نہایت خوبصورت
اور سبز رنگ کے کیڑوں کو نگلنے کے لیے
خاندانی قبر گاہی باغ، پھولوں کے گچھوں کی خوشبوؤں سے بھر گیا اور ایک ننھی سی لڑکی (بہن) مر چکی ہے، میں ان پھولوں کی خوشبوؤں سے نہال ہوتا رہا ہوں (جو بہت نفیس ہیں) اس کے سرخی مائل بھورے رنگ والی خوشبودار لکڑی کا تابوت جسے اب رکھ دیا گیا ہے مرکزی کمرے میں
اس کو ابھی نہیں مارنا تھا، وہ تو چڑیا تھی فضاؤں میں منڈلاتی ہوئی

گنگنانے کی آواز نکالتی تھی، جس کو پتھر پھینک کر مار دیا گیا

مگر یاد آتے ہیں زمیں پر بچوں کے بنے ریت کے گھروندے کہ وہ بہت باوقار تھے۔ زمین جیسے جھک جاتی تھی ہمارے کھیلوں کے دوران (ایسے جس طرح پرانے زمانے کے سادہ لوح لوگوں میں عاجزی ہوا کرتی تھی) جیسے خادماؤں میں انکسار ہوتا ہے، انھیں حق حاصل ہے کہ وہ بیٹھ سکتی ہیں کرسی پر، چاہے گھر والے گھر میں ہی کیوں نہ ہوں۔

سینٹ جان پرس—

○

انیس اشفاق

غزلیں

(1)

یہ سانس چل رہی ہے پھر بھی مر رہا ہوں رات دن
میں کون سے عذاب سے گزر رہا ہوں رات دن

ہوا کے سامنے ہے میرا پارۂ وجود ہیچ
سو ہر طرف ورق ورق بکھر رہا ہوں رات دن

طواف کر رہا ہے سر پہ اک پرندۂ عتاب
اسیرِ پنجۂ اجل ہوں، ڈر رہا ہوں رات دن

نواحِ قریۂ بدن میں وہ جو اک ڈھلان ہے
اُسی ڈھلان کی طرف اُتر رہا ہوں رات دن

محیطِ موجِ مرگ کی گرفت میں ہوں آجکل
اسی میں ڈوب ڈوب کر اُبھر رہا ہوں رات دن

ہمیشہ ہر چمن میں تھا شریکِ گریہ ہائے گل
سو پوری عُمر آنسوؤں سے تر رہا ہوں رات دن

سبیلِ وقت پر کھڑا فنا کی تیز دھوپ میں
جو کوزے خالی ہو گئے ہیں، بھر رہا ہوں رات دن

یہ زندگی پہاڑ ہے، پہاڑ کاٹتا ہے کون
مگر انیسؔ میں یہ کام کر رہا ہوں رات دن

(2)

سب خوش نظراں دیدۂ حیران سے ہٹ جائیں
گر میرے ہرن دشت و بیابان سے ہٹ جائیں
ایسا بھی نہیں سر کہ ترے سامنے جھک جائے
ایسی بھی نہیں تیغ کہ میدان سے ہٹ جائیں
آنے کو ہے اِس راہ میں اُس گل کی سواری
سارے خس و خاشاک گلستان سے ہٹ جائیں
بجھنا ہے اگر آگ تو یہ تیز ہوائیں
کچھ دیر کو اس قریۂ ویران سے ہٹ جائیں
یہ ہم جو ترے دھیان میں رہتے ہیں بہ ہر آن
کیا ہو جو کسی آن ترے دھیان سے ہٹ جائیں
باندھا ہے مری جان تو قائم بھی رہیں گے
ہم تیری طرح کب ہیں جو پیمان سے ہٹ جائیں
آتے نہیں گاہک تو اٹھالیں گے خسارہ
نقصان میں کیوں عشق کی دوکان سے ہٹ جائیں
دیکھو گے کہاں اور ستاروں کا ٹھکانہ
آنسو جو مرے کل مری مژگان سے ہٹ جائیں
میں نے جو ترے ہجر میں دن رات لکھی ہیں
اچھا ہے وہ غزلیں مرے دیوان سے ہٹ جائیں

(3)

اب کے ہمارے شہر میں شورِ نوا کچھ اور ہے
سن تو رہے ہیں اور کچھ لیکن ہوا کچھ اور ہے

کرسیِ عدل پر عجب ہے اس کی منصفی کا ڈھب
میں نے کہا کچھ اور تھا اس نے سنا کچھ اور ہے

اب کے شجر کی شاخ پر کوئی نہ آئے گا ثمر
پہلے ہَوا کچھ اور تھی اب کے ہَوا کچھ اور ہے

میں نے امیرِ شہر کے جھوٹ کو جھوٹ کہہ دیا
پہلے بھی کم خفا نہ تھا اب وہ خفا کچھ اور ہے

تجھ کو شہی پہ اپنی ناز اور میں شہی سے بے نیاز
تیرا سرور اور کچھ میرا نشہ کچھ اور ہے

عشق کسی سے کر کے دیکھ تو بھی کسی پہ مر کے دیکھ
وہ جو ہے اِس میں جاں کنی اُس کا مزہ کچھ اور ہے

شمع شبیہِ یار کی جب سے ہے یاں دھری ہوئی
خانۂ دل کے طاق میں اُس کی ضیا کچھ اور ہے

دیکھ کہ ایک ہی شاخ پر دونوں دوئی میں ہم دگر
برگ کا پیرہن ہے اور، گل کی قبا کچھ اور ہے

معنی بدل گئے ہیں سب اِس کا ہے ایک ہی سبب
میں نے لکھا کچھ اور تھا اس نے پڑھا کچھ اور ہے

تسکیں نہ دے کوئی حبیب دارو نہ دے کوئی طبیب
دل میں جو میرے درد ہے اُس کی دوا کچھ اور ہے

ہے جو نظر کے سامنے وہ تو نظر کا ہے فریب
تیرے ہر ایک نقش میں میرے خدا کچھ اور ہے

ق

باغ نہیں وہ باغ ہے شاخ نہیں وہ شاخ ہے
دستۂ گل ہے اور کچھ دستِ صبا کچھ اور ہے

(4)

جو ہوگا مالک ارض و سما کے سامنے ہوگا
مرا اچھا برا سب کچھ خدا کے سامنے ہوگا
شبِ ظلمت میں تابندہ اُسی کی لَو کو رہنا ہے
دیوں میں جو دیا اب کے ہوا کے سامنے ہوگا
سفینے غرق ہو جاتے ہیں جس کی تند موجوں میں
وہ دریا بھی کبھی سیلِ فنا کے سامنے ہوگا
میں زیرِ آسماں تیرے لیے جب ہاتھ اٹھاؤں گا
ستارہ سا کوئی دستِ دعا کے سامنے ہوگا
خزاں جانے کو ہے کل دیکھنا اِس باغ کا منظر
ہر اک گل خندہ لب طشتِ صبا کے سامنے ہوگا
کیا کرتا تھا جس غم میں وہ آکر میری غمخواری
وہی غم اب مرے غم آشنا کے سامنے ہوگا
جہاں جا کر بھٹک جانا ہے اس کو اپنی منزل سے
اک ایسا راستہ بھی رہنما کے سامنے ہوگا
انیسؔ خستہ جاں کو بھی اسیرِ مرگ ہونا ہے
کسی دن وہ بھی زندانِ قضا کے سامنے ہوگا

(5)

طاق آواز دے یا در، نہیں جانے والا
نکل آیا ہوں تو اب گھر نہیں جانے والا
لاکھ ہنگامہ ہو اس شہر میں شورش ہو بہت
تیغ کے آگے کوئی سر نہیں جانے والا
یہ جو دیکھا ہے تری خوش بدنی کا منظر
میری آنکھوں سے یہ منظر نہیں جانے والا
لکھ دیا بنتے ہی میں نے یہ مکاں اس کے نام
سو مرے دل میں وہ آکر نہیں جانے والا
رات بھر اس کو ستاروں میں سفر کرنا ہے
رات بھر ماہِ منور نہیں جانے والا
اس کے آنے کی خبر ہے تو اسے دیکھے بغیر
باغ سے کوئی گلِ تر نہیں جانے والا
پہلے آئے مری جانب ترا پیمانۂ چشم
یوں تری بزم سے اُٹھ کر نہیں جانے والا
شہر میں لفظ فروشی جسے منظور نہیں
پیشِ حاکم وہ سخنور نہیں جانے والا
طاق پر سب نے سجا رکھی ہے اپنی تلوار
سوے میداں کوئی لشکر نہیں جانے والا
حرف روشن تو ہمیشہ رہا مٹھی میں انیس
ہاتھ سے میرے یہ گوہر نہیں جانے والا

جینت پرمار

نظمیں

(1)

اذان کی روشنی

صبح سویرے
مسجد کے نیلے گنبد سے
پہلی اذاں کی روشنی ٹپکی
کانوں کے اندھیارے میں!

○

(2)

کشمیر کی پینٹنگ

کنول سجا کے جوڑے میں،
پہن کے فرکا اوور کوٹ،

ہتھے میں تمباکو بھر کر،
ہاؤس بوٹ کی ٹیک لگا کر؛
جاڑے کے موسم میں بیٹھی رہتی ہے
بڑے سکوں سے چرپائی پر
اُجلی دھوپ!

○

(3)

تین مصرعے

(باشو کے واسطے)

ڈال پر کھل اُٹھے ہیں
تین گلاب،
تین مصرعوں کے
ہائیکو جیسے!

○

باشو Matsuo Bashu (1644=1694)

(4)

پیغام

علامہ اقبال تمہاری نظموں سے
نکال دوں پیغام تو آخر
بچا رہے گا کیا نظموں میں!
کہیں نہ انساں دِکھائی دے گا
دِکھائی دے گا بحر کی ہینگر پر
صرف رنگیں لباس شاید!

○

(علامہ اقبال سے معذرت کے ساتھ)

(5)

غالب کے مزار پر نواب جان

رنگیں تتلی
طاق میں اک قندیل جلا کر،
مزار غالب پہ سجدہ کر،
دیوانِ غالب کا بوسہ لیتی ہے

پہن کے لفظوں کے گھنگرو، پھر
الاپتی ہے بھیروی کے مدھم سر میں:
کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب غزل سرا نہ ہوا

○

(6)

وصیت نامہ

پڑی رہے گی،
جب تک دل کے کونے میں
تب تک ہی ہے
نظم تمہاری!

جب وہ اُترتی ہے کاغذ پر
بن جاتی ہے وصیت نامہ!

○

(7)

پوئٹری تھیراپی

میرا من ہے۔
ٹی وی کی رنگین ہزاروں چینل جیسا!
جنوں نے میرے پسند کی ہے، ایسی چینل

جو نظموں سے بھری پڑی ہے،
رقص غزل پر سر دھنتی ہے؟

میری خوشیاں.....
پھولوں کی مانند تر و تازہ رہتی ہیں!!

○

(8)

ڈاکٹر باباصاحب امبیڈکر

بوڑھے برگد کی چھاؤں میں
سفید سنگ مرمر کا ہے
مجسم؟ باباصاحب کا!!

ہار گلے میں ہے پھولوں کا
اور آسمان نیلا نیلا،
میری نظر ہے ان پھولوں پر
لیکن دل تو دھڑک رہا ہے
اُٹھی ہوئی اُنگلی کی جانب!
مجسمہ میں!!

○

خلیل مامون

غزلیں

(1)

دل میں اک اضطراب ہے اب بھی
آنکھ میں کوئی خواب ہے اب بھی
بارشیں ختم ہی نہیں ہوتیں
شہر سیلاب ہے اب بھی
ڈوبنے کی جگہ کہاں ڈھونڈیں
دریا پایاب ہے اب بھی
موت ہی حکمران ہے ہر سو
زندگی ایک خواب ہے اب بھی
منزلیں ہی نہیں ہیں رستے میں
دل خانہ خراب ہے اب بھی
ظلمت شب کے اندھے طاقوں میں
چشم مہتاب ہے اب بھی
دل زمرد سا لہلہاتا ہے
جسم زہراب ہے اب بھی
نور فردا ہے دو جہانوں میں
عالم اک آفتاب ہے اب بھی
زیست بے کار ہی سہی مامون
ایک کار ثواب ہے اب بھی

○

(2)

وارفتگی شوق سے حاصل ہوا بھی کیا
کرتا بھی کوئی لے کے ہنر سے سوا کیا
آخر جدا ہی ہونا تھا اس راہ میں کبھی
کرتے ہمارے ساتھ وہ عہد وفا بھی کیا
باقی نہیں امید جفا کی بھی اب کوئی
تجھ سے بھلا کسی کا کبھی کچھ ہوا بھی کیا
سارا جہاں تلاش کے رو پوش ہوگئے
گر آسماں نے ہم پہ کرم جو کیا بھی کیا
مامون ہے فراغت دنیا کا نام موت
ملتی ہمارے درد کی کوئی دوا بھی کیا

○

(نظمیں)

(1)

نہیں سرفرازی
نہ کچھ امتیازی
سارے نجم وقمر

آسمانوں سے بکھرے
جہانوں سے
روپوش ہیں
سب آتمائیں
جسموں میں ملبوس
کاغذی پیراہن میں
سوکھے پتوں کی مانند
طوفان میں اڑ رہے ہیں
گریں گے کہاں
راکھ کا کون سا
حصہ بنیں گے
خبر ہے کسے

○

(2)

سلسلہ

یہاں تو کوئی سلسلہ نہیں
جو ختم ہو
ازل سے بہ رہا ہے
دریا نور کا
خیال وخواب کا سفر
جسم وجاں تلک
ایک چشمۂ ضیا

کہکشاؤں کا فلک
ہر ایک لمحہ
سبزۂ بہار
سبز سبز پتے
گلاب پھول
عظیم عظیم راستے
بڑی منزلیں
سنگ میل
اخضری ہرے بھرے سے جنگل
سفید ریت
چمکتی سونے کی طرح
چاندی جیسا پانی
کبھی تو دریا
اور کبھی آبشار
جھیل کا خموش
نیلا میٹھا پانی
ایسے چپ ہے
جیسے
خدا سے ہم کلام ہے
وقت کے سنہرے پیڑ پہ
ناموں کے سرخ و گلاب
خلا کے اندھکار کو اجالتے ہوئے
غلط ہو یا صحیح ہو
وجود کا
یہ ٹوٹا پھوٹا آشیاں

یہی تو میرا گھر ہے
میں اس کو چھوڑ کر
کہاں پہ جاوں
کبھی جو سانس ٹوٹنے لگے
اسی کی تیلیوں میں
پناہ لوں گا
اسی میں سوؤں گا
اک ایسے خواب کی
آرزو لیے
جسے کبھی نہ دیکھ پاؤں گا

○

(3)

اپنے دوست کے ساتھ

میری دوستی اسی سے ہے
جو میری خاموشی کو
چپ چاپ سنتا ہے
ایک لفظ بھی بولے بنا
پیار اسی سے ہے
جو بانھیں پسارے
مجھے آغوش میں
لینے کے لیے
ہر گلی
ہر موڑ

ہر منزل
اور
ہر چوراہے
اور
ہر سنسان مکان
اور
ہر بھاگتے ہوئے
لمحاتی وقت کے
بہتے دھارے پر
کھڑا ہے
میں
اس کے بغیر
نہ جی سکتا ہوں
نہ ہی مر سکتا ہوں
میں اسی سے
ہر گھڑی
بات کرتا ہوں
اور اس کو ہی
اپنی دکھ بھری داستان سناتا ہوں
وہ میری باتیں سن کر
ہنس دیتا ہے
اور سنز سبز ٹہنیوں پر
پھول کھل اٹھتے ہیں
آسمان میں قوس قزح کے
سات رنگوں کی کمان
ابھر جاتی ہے

افق پر
شفق کی لالی مسکرانے لگتی ہے
مجھے کسی جنت کی آرزو نہیں ہے
میرے لیے
جسم و جان کا دوزخ ہی کافی ہے
جہاں نارنجی نارنجی پھولوں میں
سب کچھ جل جاتا ہے
میں
اسکی وبھوتی پیشانی پر ملے
ذات کی اوبڑ کھابڑ وادی سے
نیچے اتر جاتا ہوں
اور اس کا
ٹھنڈا ٹھنڈا لمس لیے
دریا میں بہنے لگتا ہوں
کسی ٹوٹے ہوئے سوکھے پتے کی طرح
ایک بے منزل مسافر
جو ہمیشہ چلتا رہتا ہے
ہر جنجال سے اپنے آپ کو مکت کرنے کے لیے
میں کچھ نہ بھی کروں تو
راستہ بن ہی جاتا ہے
ایک ایسا راستہ
جہاں سے کہیں
جانا نہیں ہے
کہیں آنا نہیں ہے

○

(4)

انقلاب

میں جہاں ہوں
وہاں
رات کے تین بج رہے ہیں
پتہ نہیں
باہر خلا میں کیا ساعت ہے
گلی میں راستے کے کتے بے تحاشہ بھونک رہے ہیں
کاش میں ان کی زبان سمجھ سکتا
طبیعت ایسے بگڑی ہے
کہ سنبھالے نہیں سنبھلتی
بگڑتی ہی چلی جاتی ہے
نیند بھی نہیں آتی
گویا آنکھیں بھی
پرائی ہوگیں ہیں
انہیں سمجھانے میں
ابھی بہت دیر لگے گی
(احوال خوش انہوں کا ہم بزم ہیں جو تیرے)
میں تو
ہمیشہ سے اجنبی تھا
خود اپنے لیے بھی
مہاتما بننے میں دیر نہیں لگتی
زندگی کو موت
اور

موت کو ہنسی بنانے میں
دیر نہیں لگتی
دیر لگتی ہے

چپ چاپ
غم سہتے رہنے میں

جیتے رہنے میں

بار بار مرتے رہنے میں
شاید آواگون کا پھیر سچ ہے
پیدا ہونے کو بے چین
شاید میرے اندر بھی کوئی نبی ہے
جو اپنے پیروکاروں کی
تلاش میں

در بدر بھٹک رہا ہے
بھونک بھونک کر شاید
کتے تنگ آ چکے تھے
اب دوسری گلی میں چلے گئے ہیں
شاید

باہر اب رات کا سناٹا ہے
مگر جھینگر بول رہے ہیں
اندر بھی سناٹا ہے
مگر وہاں
جھینگر نہیں بولتے
کچھ بھی نہیں بولتا

اندر
شاید کچھ نہیں ہے

سناٹا بھی کب تک
جب تک حواس باقی ہیں
نیند بھی نہیں آتی
سونا بھی کون چاہتا ہے
صرف سکون کے دو پل میسر ہوں
تو ایک جھپکی لے لوں
ایک کائنات سے
دوسری میں جا کر واپس آ جاؤں
اس اثنا میں
پرانے سکے بدل چکے ہوں
اپنی پہچان کی طرح

○

(5)

اڑتی ہوئی روشنائی کے نام

نہ آواز
نہ ساز
نہ دلوں کا گداز
سب باقی تھا
جب تک میں تمہیں دیکھ رہا تھا
تم مجھے سوچ رہے تھے
خیال میں
خواب میں
چلتے پھرتے

ہوا کے جھونکے اسے اڑا کر نہیں لے جا سکتے تھے

دریا کا پانی ہو
یا آنکھ کا آنسو
اسے بہا نہیں پایا
آج بھی
جب تک میں تمہیں دیکھ رہا ہوں
سب باقی ہے
مگر یہ غنودگی کی غائب آنکھ میں
زندہ نہیں ہے
وہاں تو اب اس کا ہیولیٰ بھی نہیں
نہ کسی قسم کا دھوکہ ہے
خالی لوح پر جب تک
قلم نہ چلے
کچھ پڑھا نہیں جاتا
کہیں بھی کوئی تحریر نہیں ابھرتی
تحریر کو
کوئی مٹاتا بھی نہیں
روشنائی پھیکی پڑنے پر
اپنے آپ مٹ جاتی ہے
میری تحریر بھی شاید
پرانی ہو گئی ہے
روشنائی اڑ رہی ہے
میرا دل گھبراتا ہے
کبھی خود سے شرماتا ہے
وجود سے بھی

ہر ایک شے سے حیا آتی ہے
جانے یہ کیا بلا آتی ہے
دل سے ہر چیز مکر جاتی ہے
کاش میں
تمہارے ہاتھ کا قلم ہوتا
اور لکھتا ہی جاتا

○

رشید افروز

مناجات

خدارا! مَیں خطا کار ہوں

دلِ مضطرب کو سکون دے، کسی روز صبر و قرار دے
مَیں اسیرِ بحرِ حیات ہوں، سرِ شام پار اُتار دے

رگِ دل ہی تیرا مقام ہے، مِری جاں میں تیرا قیام ہے
ترے ذکر سے مجھے کام ہے، مِرے روز و شب کو سنوار دے

کبھی کار زارِ حیات میں، نہ شکستِ دل کا ملال ہو
مِرا ظرف اپنی مثال ہو، مجھے غم کی حد سے گزار دے

تہہِ آب جن کا نصیب ہے، یہ بھنور ہی اُن کا حبیب ہے
جنہیں زندگانی عزیز ہے، انہیں ساحلوں پہ اُتار دے

جو مجھے دیا، وہ بھی کم نہ تھا، جسے کھو دیا، وہ مِرا نہ تھا
یہ سفر سے واپسی کا وقت ہے، اِسے عافیت سے گزار دے

غزل

بتا اے موجِ دل! ہونے کو ہے کیا
متاعِ نقدِ جاں! کھونے کو ہے کیا

تھکن سے چُور کیوں سارا بدن ہے
سفر کا خاتمہ ہونے کو ہے کیا

ہمیں کیوں نیند سی آنے لگی ہے
شبِ ہجراں! سحر ہونے کو ہے کیا

خُدا آباد رکھّے..... آپ کا غم!
نہ ہو یہ غم تو پھر رونے کو ہے کیا

زمیں بنجر، نہ دانہ ہے، نہ پانی
تمنّا کے سِوا بونے کو ہے کیا

ہم اپنا بوجھ اب تک ڈھو رہے ہیں
تمہارا بوجھ بھی ڈھونے کو ہے کیا

گنوا دی زندگی کارِ عبث میں
ہمارے پاس اب کھونے کو ہے کیا

جو ہونا تھا، وہ سب کچھ ہو چکا ہے
نہ جانے اور اب ہونے کو ہے کیا

زمیں خاموش ہے اور آسماں چُپ!
کسی دِن دیکھنا، ہونے کو ہے کیا

(2)

سفر جاری ہے ، جب دِن ڈھل چکا ہے
نہ جانے فاصلہ کیوں بڑھ گیا ہے

نہیں روشن کچھ اِس دشتِ سفر میں
مسافر کو خدا کا آسرا ہے

خدا کے پاس ہے ساری خدائی
ہمارے پاس آخر کیا دھرا ہے

اندھیرا اس قدر گہرا نہیں تھا
چراغوں میں لہو کم ہو گیا ہے

نہ جانے کس لئے آئینہ خانہ
مجھے اب دیکھ کر حیرت زدہ ہے

سبھی اوصاف دھندلے پڑ گئے ہیں
غبارِ وقت نے کجلا دیا ہے

حصارِ ذات کی سرحد سے آگے
نہ جانے دُور تک کیا سلسلہ ہے

مجھ ایسے مصلحت نا آشنا سے
فقط تم ہی نہیں دنیا خفا ہے

(3)

لاکھ ہنس بول لیں ہم، پھر بھی گِلہ رہتا ہے
کوئی موسم ہو، مگر زخم ہرا رہتا ہے

کچھ طبیعت کو ہے افسردہ دِلی سے نسبت
اور کچھ رنج بھی اب دل کو سِوا رہتا ہے

''کی مِرے قتل کے بعد اُس نے توبہ''
اب مِرے حق میں وہ مصروفِ دُعا رہتا ہے
(غالب)

کِس طرح خلوتِ دِل میں ہوا اوروں کا گزر
لوگ کہتے ہیں کہ اِس گھر میں خدا رہتا ہے

دھوپ بھی چاہیے، پانی بھی، ہوا بھی، ورنہ
بیج مٹّی میں دبا ہو تو دبا رہتا ہے

''کی مِرے قتل کے بعد اُس نے توبہ
ہائے! اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا''
(غالب)

(4)

غزل

مقدّر میں ہمارے کیا نہیں ہے
خزانہ ہے! مگر زیرِ زمیں ہے

بڑی رونق ہے اِس دنیا میں، لیکن
ہمارا دِل کہیں لگتا نہیں ہے

یہی بہتر ہے، اُس کو بھول جائیں
وہ اب ویسے بھی یاد آتا نہیں ہے

جلا کر راکھ کر دی ساری بستی
مکاں باقی نہ اب کوئی مکیں ہے

سرائے میں بسر کی عمر اپنی
ٹھکانہ آخری دو گز زمیں ہے

سبھی کو ہے گِلہ اِک دوسرے سے
شریکِ غم یہاں کوئی نہیں ہے

ہمارے درمیاں کیا کچھ نہیں تھا
مگر افسوس! اب کچھ بھی نہیں ہے

جہاں تک دیکھنا ہم چاہتے ہیں
دِکھائی دے! ضروری کیوں نہیں ہے ؟

یہ کِس نے ڈھانپ دی کہرے کی چادر
ندی کروٹ بدلتی کیوں نہیں ہے ؟

(5)

غزل

نئی زمین، نیا آسمان میرا ہے
بہت دِنوں سے یہ سارا جہان میرا ہے

وہ شاخ جس پہ کوئی پھول اب نہیں باقی
مہک رہی ہے، جہاں تک گُمان میرا ہے

یہ فرشِ خاک، یہ مٹّی کی چار دیواریں
اور اس پَہ گھاس کا یہ سائبان میرا ہے

یہ کون دور سے آواز دے رہا ہے مجھے
کوئی تو ہے ! جسے اب تک گُمان میرا ہے

بہت بُرا ہوں مگر پھر بھی یاد آؤں گا
میں جانتا ہوں کہ یہ بھی گمان میرا ہے

عداتوں میں بھی پنہاں ہے دوستی کا بھرم
وہ مجھ سے لاکھ سہی بدگمان، میرا ہے

بدل گئے سبھی کردار اس کہانی کے
مجھے بدل نہ سکے گا! گمان میرا ہے

(6)

غزل

میں ابھی زندہ ہوں لیکن وقت کی ٹھوکر میں ہوں
ایک ہی کوشش ہے اپنے ساتھ قائم رہ سکوں

یہ بھی کیا انصاف کہ ہر ظلم مجھ پر ختم ہو
میں کوئی پتھر نہیں! آخر کہاں تک چُپ رہوں

پست ہمّت ہوں مگر یہ حوصلہ رکھتا ہوں میں
پھونک کر ہاتھوں سے گھر اپنا تماشا دیکھ لوں

اُس کے میرے درمیاں فاصلہ بے شک نہیں
آسماں چھونے سے پہلے قد بھی اپنا ناپ لوں

آج تک اثبات میری راہ میں حائل رہا
اب یہ بہتر ہے میں خود اپنی نفی کرتا چلوں

کب تلک چھپتا رہوں گا عکس آخر عکس ہے
لا ادھر آئینہ! اپنی خاک اس پر ڈال دوں

نارسائی

سحر کی سفیدی
شفق کے حسیں رنگ
سیہ رات میں جگنوؤں کی چمک
نگاہوں سے اوجھل نہیں ____!

پرندوں کی معصوم چہکار
موجوں کا دِلکش ترنّم
شکستہ کواڑوں پہ دستک ہوا کی
سُنائی نہ دے، ممکن نہیں ____!!

لڑکپن کی ضد کے انوکھے تقاضے
وفا آشنا دِل کی انجان خواہش
جہاں دیدہ آنکھوں کے شفّاف آنسو
سبھی اپنے محور پہ قائم ہیں ____ لیکن
مُدّت ہوئی ____
راڈار کی زد میں کچھ بھی نہیں ____!!

پیارے وطن

اے مرے پیارے وطن!
میرے محبوب وطن!!
تیری مٹی سے نمو پا کر
جب بھی سرسبز ہونے لگتا ہوں،
کیوں مرا خوں نچوڑ لیتا ہے ____ ؟
جب کبھی چار تنکے چُن کر
آشیانہ بنانے لگتا ہوں،
بجلیاں کیوں چمکنے لگتی ہیں ____ ؟؟
کِس لیے اپنی شاہ راہوں پر
تو مجھے سنگسار کرتا ہے ____ ؟؟
کیوں مجھے شرمسار کرتا ہے ____ ؟؟؟
میری تقصیر کیا ہے، کچھ تو بتا.....
کیوں مجھے بے وفا سمجھتا ہے ____ ؟؟؟

سحر ہونے تک

ہم ایسے لوگ زمانے میں اِک تماشا تھے
کہ زندگی سے کبھی اپنی دوستی نہ رہی _____!
جو خواب ہم نے سجائے ____ دھواں دھواں نکلے!
شریکِ کار تھے جتنے حریف جاں نکلے ____
ہم اپنی ذات کی سرحد پہ سنگسار ہوئے _____!
یہ وہم دِل میں لئے پھر رہے تھے سڑکوں پر
زمیں نہ ساتھ اگر دے تو غم نہیں کوئی
خلا کے سر پہ حسیں آسماں ہمارا ہے _____!!
تمام شب یونہی گزری قمار خانے میں
جو داؤ ہم نے لگایا، وہی غلط نکلا _____!!
جو اپنے پاس تھا سرمایہ سب لٹا بیٹھے _____!!

شاید

تُم سے مِل کر
اِک ان دیکھی، انجانی
بے نام خوشی کی لہر بدن کو چھو لیتی ہے ____ !
تُم سے مِل کر
پیاسی مٹّی سے
خوشبو پھوٹنے لگتی ہے ____ !
تُم سے مِل کر دِل کہتا ہے
شاید تُم وہ شخص ہو ____ جس کو
میں برسوں سے ڈھونڈ رہا تھا ____ !
شاید ____
تُم سے جیون پتھ پر
ملنے سے پہلے بچھڑ گیا تھا ____ !!

وہ دن خواب تھے یا کہانی

مجھے یاد ہیں ساری باتیں _____!
وہ دِن خواب تھے یا کہانی
مگر یاد ہیں ساری باتیں _____!
سنہرے ہرن کے تعاقب میں
اندھے سفر کی کہانی تھی یا خواب تھا،
_____ مگر یاد ہے _____!
سفر میں اگر
ریت سے کوڑیاں مِل گئیں
تو بہت خوش ہوئے _____!!
کبھی سرد جھونکا
بدن چھو کے گزرا،
تو ایسا لگا _____ جیسے برسوں سے ٹھہرا ہوا
زرد موسم بدل جائے گا _____!
اور بنجر زمیں سے نئی کونپلیں جنم لیں گی _____!
مگر _____ بے سبب چلتے چلتے
سبھی خواب مُرجھا گئے _____!
ہمیں اب نہ پانے کی حسرت،
نہ کھونے کا دُکھ ہے _____!
زمانہ ہوا _____
اپنے ہونے نہ ہونے کا
احساس تک مِٹ گیا ہے _____!!

نصیر احمد ناصر

غزلیں

(1)

حصول ذات میں رد شکیبائی سے پہلے
انالحق کہہ رہا تھا میں جبیں سائی سے پہلے

سبک رو کون تھا ہم سا بتا اے برج عقرب
گذرگاہ انا پر آبلہ پائی سے پہلے

مجھے معلوم ہونی چاہیے تھی مرضی شب
حریم جاں میں خوابوں کی پذیرائی سے پہلے

خدائے روشنائی جامہ قرطاس میں آ
بساط مشتری پر اپنی پسپائی سے پہلے

سنا ہے قریہ جاں میں بھی شور ہاؤ ہو تھا
فغاں انگیز منظر باف تنہائی سے پہلے

○

(2)

سفر کے باب میں رخت سراب ہار نہ جاؤں
کچھ ایسا کر مرے دریا میں تیرے پار نہ جاؤں

حریر زیست الجھ مت مرے وجود کے ساتھ
میں تیرا عقدۂ پر پیچ استوار نہ جاؤں

بحکم دل سوئے وحشت کدہ ہے قصد سفر
ترے کہے پہ کہاں اے ستم شعار نہ جاؤں

پھر اضطراب طلب کھینچتا ہے شاخ بدن
انا مصر ہے ترے در پہ زینہار نہ جاؤں

حد نگاہ میں کچھ بھی نہیں ہے کچھ بھی نہیں
میں ایسی چشم نوردی پہ چشم وار نہ جاؤں

○

(3)

وہ ریگ سرخ وہ رقص شرر نہیں جاتے
سراب زیست سے دیوار و در نہیں جاتے

پلٹ کے جانا ترے در پہ تھا عذاب مگر
ہم اپنی جان سے جاتے اگر نہیں جاتے

یہ کس جنون کا سایہ ہے میرے قدموں پر
بھٹکتے رہتے ہیں راہوں میں گھر نہیں جاتے

ہم اپنی ذات میں ٹوٹے ہوئے بہت ہیں مگر
سنبھال رکھا ہے خود کو بکھر نہیں جاتے

یہ کس نے کہہ دیا فرقت کا ہے ملال بہت
یہ بات ہوتی تو جاں سے گزر نہیں جاتے

یہ ہجرتیں، یہ صدائیں، یہ خواہشیں، یہ شکست
ہم ان کی قید میں رہتے ہیں مر نہیں جاتے

○

(4)

ریگِ ہستی کا استعارہ بن
اے سمندر! کبھی کنارہ بن

یومِ وارفتگی منا اک دن
رقص کرتے ہوئے شرارہ بن

اپنی مرضی کی شکل دے خود کو
خود کو سارا مٹا، دوبارہ بن

ایک دھاگے سے باندھ لے خود کو
ہلکا پھلکا سا ہو، غبارہ بن

میری آنکھوں میں آ محبت سے
میرا دیکھا ہوا نظارہ بن

مجھ میں تعمیر کر مکاں اپنا
میرا آنگن، مرا اُسارا بن

اتنی خاموشیوں سے بہتر ہے
کوئی معنی بھرا اشارہ بن

بادلوں سے اتر، زمیں پر آ
آبِ استادہ! تیز دھارا بن

صبح تک خوب جگمگا ناصر
رات کا آخری ستارہ بن

○

(5)

اک ستارہ زمین پر آیا
نور سارا زمین پر آیا
گلِ مشکی بہشت میں نکلا
سنگِ خارا زمین پر آیا
آسماں نے علامتیں رکھ لیں
استعارہ زمین پر آیا
پہلے اونچا اڑا فضاؤں میں
پھر غبارا زمین پر آیا
دکھ سے رونے لگا سمندر بھی
جب کنارا زمین پر آیا
کیا کشش ہے کہ پھل درختوں کا
گر کے سارا زمین پر آیا
اک پہاڑی کو چومنے کے لیے
ابر پارہ زمین پر آیا
جب زمیں نے اکھاڑنا چاہا
ہر سہارا زمین پر آیا
پہلے آنگن کا ہر شجر اکھڑا
پھر اُسارا زمیں پر آیا
جسمِ گم کردہ ڈھونڈنے کے لیے
میں دوبارہ زمین پر آیا
کیسی آنکھیں ہیں، دیکھنے جن کو
ہر نظارا زمین پر آیا
اے خدا! تیرے آسمانوں کا
بوجھ سارا زمین پر آیا

○

(6)

جاتے جاتے یہ کر گیا دریا
ہم کو مٹی سے بھر گیا دریا

داستاں چھوڑ کر تباہی کی
بستیوں سے گزر گیا دریا

چند دریاؤں جیسے لوگوں کی
جان لے کر اُتر گیا دریا

ایسی بارش ہوئی اندھیرے کی
روشنائی سے بھر گیا دریا

میں سمندر مثال تھا شاید
میرے اندر اُتر گیا دریا

چشمِ پُر آب تک تو دیکھا تھا
پھر نہ جانے کدھر گیا دریا

کچھ پرندوں کا شور تھا اتنا
کچھ درختوں سے ڈر گیا دریا

تا سمندر تھا وعدہ چلنے کا
راستے میں مکر گیا دریا

ناؤ لے کر جدھر گئیں موجیں
پیچھے پیچھے اُدھر گیا دریا

جانے کیا دشمنی گھڑے سے تھی
دیکھتے ہی بپھر گیا دریا

ڈوبنے سے تو بچ گیا ناصر
آ کے کشتی میں مر گیا دریا

○

نظمیں

(1)

اِنَّمَا نَحنُ مُصلِحُونَ

صف باطل میں گھر کر!
حق نے
نیلے آسماں کی سمت دیکھا
اور سوچا
کاش!!!
فوج ابرہا پر
پھر ابابیلیں مسلط ہوں
ابابیلیں چلی آئیں
مگر اس بار
منقاروں میں جو پتھر کے ٹکڑے تھے
وہ سب
حق اور اس کے چاہنے والوں کی خاطر تھے

○

(2)

منکر لفظ قم

دشت امکان میں
معصیت کی پہاڑی تلے
اک تعفن زدہ لاش
لاوارث و بے کفن
ایک مردہ دریدہ بدن
منکر لفظ 'قم'
اپنے اطراف کے
سارے عریاں مناظر کی
تحقیر کرتی ہوئی
چشم وا، منتہاؤں میں گم
کرگس وزاغ جاہ وحشم
جس کا عریاں بدن
نوچ لینے کے درپے ہیں
وہ کون ہے؟
کوئی دریوزہ گر؟
دزد اقلیم وزر؟
حیف کوئی نہیں
جرم اس کا فقط ہے یہی
کہ وہ اوصاف فقرات کو
ترک کرنے سے قاصر رہا

○

(3)

مفروضہ

ہوسکتا ہے
میرے منظر کے سارے پس منظر
بس کچھ دھندلے سائے ہوں
ہوسکتا ہے
میں جو کچھ بھی سوچ رہا ہوں
سب کچھ
بس اک بے ڈھنگا مفروضہ ہو
ہوسکتا ہے
میں نے جو تاریخ پڑھی ہے
اس کا ہر کردار
نہایت بودا ہو
لیکن اکثر سوچتا ہوں
میری فکر
مری تاریخ
مرا پس منظر
سب کچھ
اک مفروضہ ثابت ہو جائے تو۔۔۔؟

○

کاظم جرولی

غزلیں

(1)

کس قدر تازہ نوشتہ ہے تری شمشیر کا
حرفِ اول تک نہیں سوکھا ابھی تحریر کا

شام ہوتے ہی مرے خوابوں کی مضطر انگلیاں
جوڑتی ہیں ایک اک ٹکڑا تری تصویر کا

اے مرے چھالو بجھا دو ظلم کی تشنہ لبی
ہے دہن کھولے ہوئے حلقہ مری زنجیر کا

ہر ساعت میں ہمیشہ گونجتا رہتا ہوں میں
خامشی عنوان ہے جب سے مری تقریر کا

پاس جانے سے اکھڑ جاتے ہیں ظلمت کے قدم
ہے اسی صحرا میں سر چشمہ کوئی تنویر کا

ہر طرف موجود ہوں کاظم اسی صورت میں میں
مختلف مجھ سے نہیں منظر مری تصویر کا

○

(2)

دیکھا نہیں کہیں بھی اجالہ تہِ چراغ
ملتا ہے ہر چراغ کا سایہ تہہ چراغ

لو سوگئی تو نیند سے جاگا ہے آفتاب
گویا چھپا ہوا تھا سویرا تہ چراغ

بے جاں کوئی پڑا ہے، کوئی جل کے نیم جاں
ہے موت و زندگی کا تماشا تہ چراغ

ہوتی ہیں اس کے پاؤں کی ٹھوکر میں ظلمتیں
رہتا ہے جس کا ہاتھ ہمیشہ تہ چراغ

اک خواب دو اجالوں میں تقسیم ہوگیا
آدھا سرِ چراغ ہے آدھا تہ چراغ

کچھ یوں ہے میرے ذہن میں روشن ترا خیال
گویا ہو موجزن کوئی دریا تہ چراغ

روشن جبین آنکھوں میں خودرائی و حیا
گویا کھلا ہوا ہے صحیفہ تہ چراغ

تنہائیوں میں کوئی تو دیتا ہمارا ساتھ
کاظم کا عکس تو بنتا تہ چراغ

○

(3)

جو شخص تری بزم میں اب تک نہیں پہنچا
شاید وہ بہاروں کے سبب تک نہیں پہنچا

جب شام ہوئی اپنے دیے ہم نے جلائے
سورج کا اجالا کبھی شب تک نہیں پہنچا

اربابِ جنوں اور ذرا اور ذرا اور
پیغام محبت ابھی سب تک نہیں پہنچا

جس دن سے سمجھنے لگا مفہوم ہنسی کا
اس دن سے تبسم مرے لب تک نہیں پہنچا

دو آنکھیں چراغوں کی طرح کب سے ہیں روشن
گھر اپنے پلٹ کر کوئی اب تک نہیں پہنچا

افسوس کہ دنیا کی ضرورت ہے وہ سکّہ
اب تک جو کسی دستِ طلب تک نہیں پہنچا

جس پھول میں خوشبو تھی ادھر سر کو جھکایا
ہر پھول کے میں نام و نسب تک نہیں پہنچا

جو اہلِ قلم ہیں انہیں معلوم ہے کاظم
بن عشق کوئی میرؔ ادب تک نہیں پہنچا

○

(4)

پتہ نہیں ہے اجالوں کو وسعتِ شب کا
تہ چراغ بھی قبضہ ہے ظلمتِ شب کا

گلوں میں سر کو چھپائے سسک رہی ہے ہوا
سحر کے ہاتھ میں دامن ہے رخصتِ شب کا

یہ کہکشاں ہے غبارِ سفر کا آئینہ
یہ چاند نقشِ کفِ پا ہے ہجرتِ شب کا

بتا رہے ہیں کسی کے کھلے ہوئے گیسو
ہوا کی زد پہ خزانہ ہے نکہتِ شب کا

ٹھہر کے اوس کی بوندیں شجر کے پتوں پر
علاج ڈھونڈ رہی ہیں حرارتِ شب کا

تھکا تھکا سا اجالا ڈری ڈری آنکھیں
بہت عجیب ہے منظر تلاوت شب کا

وہ ایک اشک جو کاظم ہے تا سحر باقی
وہی چراغ مجاور ہے تربتِ شب کا

○

(5)

کیا پتا تیرا فلسفا کیا ہے
امتحاں کیا ہے اور سزا کیا ہے
جب کہ تو ہے نفوس کا نباض
پھر یہ سرگوشیِ دعا کیا ہے
قطرہ قطرہ ہے کیوں ہر اک دریا
زندگانی ذرا ذرا کیا ہے
جس کے جلتے ہی بجھ گئے ہیں چراغ
پوچھئے اس سے یہ ہوا کیا ہے
ہو چکے ختم سارے افسانے
اور سننے کو اب بچا کیا ہے
اپنی تقدیر خود بناتا ہوں
میں نہیں جانتا لکھا کیا ہے
ذرے ذرے میں ہے کوئی نغمہ
دونوں عالم میں بے نوا کیا ہے
غور کر ہر سکون ہے تجھ میں
خود سے باہر تو ڈھونڈھتا کیا ہے
ذرے ذرے میں جب ہے تو موجود
پھر بتا دے مجھے مرا کیا ہے
میرؔ و غالبؔ سی گفتگو کا ظمؔ
تجھ کو اس دور میں ہوا کیا ہے

○

شہپر رسول

غزلیں

(1)

ادھر بھی لہجے میں نرمی ہے اور گلہ کم ہے
کچھ ان کے سر میں بھی اب کے ذرا ہوا کم ہے

نہ شاعری کی ہوس ہے نہ فکر شہرت و نام
سو ہم نے سوچا بہت ہے مگر کہا کم ہے

کہیں تو بیٹھ کے دم لیں کہ بس بھٹکتے پھریں
یہاں پہ دھوپ بہت ہے وہاں گھٹا کم ہے

میں اپنے چہرے کے لکھے کو دیکھتا کیسے
کہ میری آنکھوں کی حیرت کو آئینہ کم ہے

یہ اپنے پن کا عجب مرحلہ ہے اے شہپر
طلب میں حکم زیادہ ہے التجا کم ہے

○

(2)

چپ گزر جاتا ہوں حیران بھی ہو جاتا ہوں
اور کسی دن تو پریشان بھی ہو جاتا ہوں

سیدھا رستہ ہوں مگر مجھ سے گزرنا مشکل
گمرہوں کے لیے آسان بھی ہو جاتا ہوں

فائدہ مجھ کو شرافت کا بھی مل جاتا ہے
پر کبھی باعث نقصان بھی ہو جاتا ہوں

اپنے ہی ذکر کو سنتا ہوں حریفوں کی طرح
اپنے ہی نام سے انجان بھی ہو جاتا ہوں

رونقیں شہر بنا لیتی ہیں مجھ میں اپنا
آن کی آن میں سنسان بھی ہو جاتا ہوں

زندگی ہے تو بدل لیتی ہے کروٹ شہپر
آدمی ہوں کبھی حیوان بھی ہو جاتا ہوں

○

(3)

میرے لمحوں کو بناتا ہے جو صدیوں کی کہانی کون ہے
مجھ میں مجھ سے ماورا شہپر وہ میرا یار جانی کون ہے

میں تو اُن کا نام بھی اپنی زباں پر لا نہیں سکتا مگر
پھر بھی وہ پوچھیں گے یہ جو کر رہا ہے لن ترانی کون ہے

اپنے اجداد و سلف کی عظمتوں میں جیسے کھو جاتے ہیں
سہ دری میں بیٹھ کر کرتا ہے جو باتیں پرانی کون ہے

میں ہوں اور میرا جنوں ہے، ماسوا کی کچھ خبر مجھ کو نہیں
کون دریا پار کرکے آگیا ہے، پانی پانی کون ہے

کر رہے ہیں پھر غزل کو اک نئے رستے پر لے آنے کی بات
کون ہے ان میں خلیل و ناصر و انشا و بانی کون ہے

ہم تو اپنی داستاں کا نصفِ اول لکھتے لکھتے سو گئے
شہپر اتنا خوبصورت لکھ گیا جو نصف ثانی کون ہے

○

(4)

بات کچھ ہوٹوں پر آتی ہے گزر جاتی ہے
ہم سے افواہ اڑانی بھی نہیں آتی ہے
پھر کسی نیند کے آغوش میں ہیں حرف و خیال
یاں پرندوں کی بھی آواز نہیں آتی ہے
پیڑ کے کرب نے طوفاں سے اشاروں میں کہا
فیصلہ ٹھیک ہے لیکن ذرا جذباتی ہے
میری تہذیب پر شروانی پہ فقرے نہ کسو
میرے تو شہر کا ماحول بھی قصباتی ہے
رنگ وہ کیسے بکھرتے ہیں کہ سج جاتے ہیں
بات وہ کیسے بگڑتی ہے کہ بن جاتی ہے
جسم ہے شہر، سراپا کوئی تہذیب کدہ
دل کہ آزاد ہے، منھ زور ہے، دیہاتی ہے

○

(5)

حرفِ جاں دل میں نہاں حرفِ زباں شہر میں تھا
آگ کا نام نہ تھا پھر بھی دھواں شہر میں تھا
بس ذرا عکس ہی ابھرا تھا صفوں سے میرا
ایک ہنگامۂ کوتاہ قداں شہر میں تھا
شور صحرا کا سنا، شور سمندر کا سنا
شور کا نام ہی تھا شور کہاں شہر میں تھا
رات ہی رات یقیں نے کئی شکلیں بدلیں
جو نہیں تھا وہی ہونے کا گماں شہر میں تھا
مستقر کس کو بناتے کہاں رہتے شہپر
گانو میں تھا تو کبھی سروِ رواں شہر میں تھا

○

نظمیں

(1)

پیش خیمہ

مجھے کچھ کہنا ہے شاید
غزل کے شعروں کی یا علم کی تخلیق ہونی ہے
یہ کیسا پیش خیمہ ہے
یہ میری روح میں گہرا، گھنا گہرا خلا کیوں ہے
یہ میری نظریں کیوں الجھی ہوئی ہیں ابر پاروں سے
یہ میرا ذہن کیوں اُڑتا ہوا محسوس ہوتا ہے
یہ میری سوچ کے رستے میں اک گہرا کنواں کیوں ہے
کنویں میں بس اندھیرا ہے
نہ پانی ہے نہ سایا ہے
مگر یہ کیسی مایا ہے
میں کیا بولوں، میں کیا جانوں
کبھی جب ایسا ہوتا تھا
تو اک آواز بے آوازی کانوں میں آتی تھی
دھنک بے رنگ سے رنگوں کی ہر سو مسکراتی تھی

کہیں پر سوچ کا لفظوں کا
اور کچھ ان کھنچے سے زاویوں کا رقص ہوتا تھا
یہ کیا شہپر سماعت کے دریچوں تک
وہ بے آوازسی آواز کیوں آتی نہیں ہے اب
نہ جادو ہے کوئی بے رنگ سے رنگوں کا سمتوں پر
نہ کوئی رقص لفظوں اور خیالوں کا
کہ شاید
روح کے گہرے گھنے گہرے خلا سے کچھ نہیں ہوتا
کسی کا کچھ نہیں کھوتا
کہیں بھی کچھ نہیں ہوتا

○

(2)

تیرگی اک فسوں

اس قدر روشنی ہے آنکھوں میں
دور تک کچھ نظر نہیں آتا
لفظ شاید سپید ہو گئے ہیں
دن ہی دن ہے مرے چہار طرف
میں، مری تیرگی میں زندہ تھا
خامۂ خواب جیسے خشک ہوا
رات تو روشنائی تھی اُس کی
مجھ کو میری حدوں میں رہنے دو

کس تگاپو میں کوئی لطف ہے یاں
دیکھنا ہے نہ کچھ دکھانا ہے
مجھ کو رک رک کے لڑکھڑانا ہے
دور تک کچھ نظر نہیں آتا
کس قدر روشنی ہے آنکھوں میں

○

(3)

چلوان پانیو کو...

چلوان پانیوں کو پھر سے یکجا کر دیا جائے
یہ مانا مختلف دریاؤں کے اپنے علاقے ہیں
یہ مانا مختلف دریاؤں کی سمتوں میں اور رفتار میں بھی فرق کا امکان وافر ہے
یہ مانا مٹیوں کا لمس ان کے ذائقے اور رنگ میں بھی فرق کرتا ہے
مگر ان پانیوں کے اول و آخر پہ بھی کچھ غور کر لیجے
وہی مطلع، وہی مقطع
غزل کے شعروں کے اُس ربطِ بے مربوط کے مانند
بظاہر جو ہے نادیدہ مگر باطن میں رقصاں ہے
اگر اس راز سے پردہ اٹھانا ہے
دماغ و دل کی آنکھوں کو اگر دیدار کے قابل بنانا ہے
تو پھر رفتار اور سمتوں، اچھوتے ذائقوں، رنگوں کے
بے معنی تفاوت کو
گوارا کر لیا جائے
چلو! ان پانیوں کو پھر سے یکجا کر دیا جائے

○

(4)

معرکۂ ہجر

اب بھی خاموشی میں گونج اٹھتا ہے لہجہ کوئی
اب بھی چونک اٹھتی ہے رہ رہ کے سماعت کی نظر
اب بھی کھلتے ہیں کتابوں میں کسی یاد کے پھول
چاہئے آج بھی لفظوں کو کوئی لمسِ طلسم
تا کہ اپنے ہی معانی کی پناہوں میں کریں رقصِ رنگ
تا کہ اپنے ہی معانی کے تلذذ سے کریں کسبِ نور
اور ہر قربِ گذشتہ کو منور کر لیں
اپنے ادراک ہی میں گھر کر لیں
آج یہ معرکۂ ہجر بھی یوں سر کر لیں

○

(5)

اچھا لگنے لگا ہے

جب میں اک کمزور سا جھونکا
رستے میں گم ہو جاتا تھا
سُست ہوا کا سایا سا تھا
کوئی نظر اٹھتی ہی کب تھی میری جانب

لفظ کہاں یوں رم کرتے تھے لب وزباں پر
دیکھ کے بھی سب ان دیکھا سا کر دیتے تھے
اب شاید میں تند بگولہ بن بیٹھا ہوں
لوگ
مجھے اب رستہ دے دیتے ہیں کتنی آسانی سے
ڈر جاتے ہیں
کچھ تو ڈر کر مر جاتے ہیں
ذکر میرا ہی ہوتا ہے ہر دوسرے پل میں
مجھ کو لیکن یہ سب اچھا کب لگتا ہے
اُف! یہ میرا بنیادی کردار نہیں ہے
تیغ تو ہوں میں
لیکن
مجھ میں جھوٹا وار نہیں ہے
جیت نہیں ہے
ہار نہیں ہے
بے مطلب تکرار نہیں ہے
لیکن
مجھ کو آنکھوں میں اور ذہنوں میں
یوں گھر کر جانا
اچھا لگنے لگا ہے

○

عین تابش

نظمیں

(1)

یہاں پہ باغ تھا کوئی

یہاں پہ باغ تھا کوئی
گھنے درختوں کا اک جھنڈ
موسموں کی المناکیوں پر
سایہ کیے رہتا تھا
ادھر سے جب بھی گذرنا ہوا
ذرا سی دیر کو
اس باغ میں ٹھہرتے تھے
کبھی کبھی تو فقط باغ میں ٹھہرنے کی خاطر
بلاسبب بھی ادھر سے گذرتے تھے
گویا وہ ایک باغ نہ تھا
لمحۂ گذراں کی تپش سے ہم کو
بچانے کا اک وسیلہ تھا
یہاں پہ باغ تھا کوئی

پرانے دور کی تصویریں
البموں میں ابھی تک سجی ہوئی ہیں
کہ ان کو دیکھ کے ایسا لگے
ہم آج بھی وہیں اس باغ میں
شگفتگی دل و جاں کے ساتھ
ہیں موجود
مگر یہ البموں کی خود فریب تصویریں
بہت دنوں نہیں چلتیں
گذرتے موسموں کے ساتھ
ان کے نقش جھلس جائیں گے
کہ البموں میں اسی طرح آگ لگتی ہے
یہاں پہ باغ تھا
کوئی گواہ بھی نہیں ہوگا
گذرتے موسم کا
کہ بھول جائیں گے سب
اس فسردہ قصے کو
کوئی نئی تعمیر
ایک تازہ کہانی کے ساتھ
وقت کی تحریر نو میں
تصورات کے تازہ ترین باغ کی
تشکیل کرنے والی ہے

○

(2)

چشم نمناک نے پوچھا

رات کی کوئی گھڑی تھی
خبر دید کا اک وہم سا
پیدا ہوا
دیوار و در و بام پہ
اک جشن کی تمثیل سا کچھ
جلوہ فرما ہوا
مشکل حکایات پر اسرار
جیسے موسم ہو بدلتا ہوا
یا جیسے برستی ہوئی
کچھ وصل کی موہوم پھوار
خبر دید کا اک وہم سا پیدا ہوا
یک بیک نامہ بے نام کوئی
رقعۂ خواب کی یا نسبت مہتاب کی صورت
اک عجب جیسے تب و تاب کی صورت
جلوہ فرما ہوا
رات کی کوئی گھڑی تھی
خبر دید کا اک وہم سا پیدا ہوا
جس کی کوئی تاویل نہ تھی
رات خاموش تھی جیسے اسے
اک لمحے کی تعجیل نہ تھی

صرف آہٹ ہوئی
دیوار و در و بام کی محزونی میں
خبر دید کا اک وہم سا پیدا ہوا
چشم نمناک نے پوچھا
کوئی آیا ہے کیا؟

○

(3)

رات میں نے حویلی کو دیکھا

(دوسرا منظر)

وقت کی بیکرانی کا بھی
اک عجب ماجرا ہے
بقا سے فنا تک
تحیر کے ملبے پر اک آستانہ
عجائب کی زنبیل سے
جیسے نکلا ہو
چالیس گھر کا خزانہ

عجائب کے لا انتہا سلسلوں کی
عجب داستاں ہے
کوئی پوچھتا ہے
جو اک شہر تھا وہ کہاں ہے
اسی بیکرانی

زمان کے اس کارِ حیرانی کے
حرف آغاز سے
نقش انجام تک
ایک روشن سحر کے
طرب ناک جلووں سے
افسانہ شام تک
رات میں نے حویلی کو دیکھا
سارے بام و در و سقف و محراب پر
رات چھائی ہوئی اس طرح تھی
کہ جیسے یہاں
صبح کا کوئی نام و نشاں
پہلے تھا ہی نہیں
ہر طرف رات
اک بیکراں رات تھی
بیکرانی کے پردے سے
چھنتی ہوئی
جاوداں رات تھی
رات میں نے حویلی کو دیکھا
صدر دروازے سے
داخلے کا سماں
ایک گم گشتہ بھولا بھلایا جہاں
اک جہانِ دگر
اس زمین کی حدیں
ختم کرتا ہوا آسمان دگر
سامنے تھا

فسوں کار آنگن
وہ آنگن
کہ جس کی کشادہ دلی
اک زمانے کی تاریخ کا
نقرئی باب تھا
منتخب معتبر محترم سائے
فرش زمرد پہ
اپنی بساطیں بچھائے ہوئے
موسموں کی گذرگاہیں
کب تک تھیں ان منظروں کی گواہ
اور پھر دیکھتے دیکھتے
سارا منظر سیاہ
وقت کی دندناتی سپاہ
کیسے آنگن میں داخل ہوئی
اس کی تفصیل میں جانا آساں نہیں
رات تھی
اتنی گہری الم آشنا رات تھی
جس نے سارے مناظر پہ
ایسی سیاہی لپیٹی
کہ صدیاں گذرتی چلی جائیں
ابواب و اسباب کھلتے نہیں
رات میں نے حویلی کو دیکھا

رات اور حویلی کا افسانہ
اک دوسرے میں

کچھ اس طرح ضم ہو گیا
دونوں کے درمیاں فاصلہ

اتنا کم ہو گیا
دونوں اک دوسرے سے
الگ ہو سکیں
جیسے ممکن نہیں
ہم نے رات اور حویلی کو
اک دوسرے کے حوالے سے
پہچاننا خود پہ لازم کیا
وہ جو تاریخ کی ایک زنبیل تھی
ہم نے دونوں اثاثہ اس بھاری زنبیل میں بھر لیا

○

(4)

''کیسی گہری نیند''

میر صاحب
آپ کو تو بچھوؤں نے ڈس لیا
کیسی گہری نیند میں تھے عالی جاہ

بے خبر بے خوف محوِ خوش خیالی
فکر عقبیٰ تو کہاں کی
فکر دنیا سے بھی خالی

کس قدر مخمور اور مسرور تھے
سرکار عالی
سب مصاحب جمع تھے
محفل جمی تھی
دادِ میری و امامت ہر طرف سے مل رہی تھی
نیند کیسے آ گئی؟
میر صاحب آپ کو تو بچھوؤں نے ڈس لیا

○

(5)

سرگوشیاں

ہوا بہت تیز چل رہی ہے
گزشتہ موسم کے سارے اصنام
یوں زمیں بوس ہو رہے ہیں
کہ جیسے باب یقیں سے
کوئی سپاہ یلغار کر رہی ہے
ہے میمنہ پر عجیب ہلچل
تو میسرہ پر ہما ہمی ہے
یہ منظر ناتمام خواب شگفتنی یا شکستنی ہے
کسی کو اس کی خبر نہیں ہے
مگر فضا میں
عجیب سرگوشیاں ہیں رقصاں

کسی کو یہ موسم تماشا
ہے مرگ ساماں
کوئی ہے منظر کی پشت پر
جیسے گل بہ داماں

○

مہتاب حیدر نقوی

غزلیں

(1)

پھر کسی خواب کی پلکوں پہ سواری آئی
خوش امیدی کو لئے باد بہاری آئی

پھول آئے ہیں نئی رت کے نئی شاخوں پر
موجۂ ماہ دل آرام کی باری آئی

نامرادانہ کہیں عمر بسر ہوتی ہے
شادکامی کے لئے یاد تمہاری آئی

اور پھر پھیل گیا رنگ محبت رخ پر
لالۂ زخم لئے یار کی یاری آئی

ایک دن ہم نے زباں کھول دی سچ کہنے کو
اور پھر شامت اعمال ہماری آئی

ہوس و عشق کے احوال رقم کرنے کو
پردۂ شعر میں افسانہ نگاری آئی

○

(2)

وہ بستیاں ، وہ بام ، وہ در کتنی دور ہیں
مہتاب ! تیرے چاند نگر کتنی دور ہیں

وہ خواب، جو غبار گماں میں نظر نہ آئے
وہ خواب تجھ سے دیدۂ تر کتنی دور ہیں

بام خیال یار سے اترے، تو یہ کھلا
ہم سے ہمارے شام و سحر کتنی دور ہیں

اے آسمان ! ان کو جہاں ہونا چاہیے
اس خاک سے یہ خاک بسر کتنی دور ہیں

بیٹھے بٹھائے دل کے سفر پر چلے تو آئے
لیکن وہ مہربان سفر کتنی دور ہیں

یہ بھی غزل تمام ہوئی، شام ہو چکی
افسوس شاعری کے ہنر کتنی دور ہیں

○

(3)

لفظ اس کے ہیں مگر ان میں روانی میری
قصہ گو کوئی سہی، ہے تو کہانی میری

لوگ راوی کے کہے کو ہی حقیقت سمجھے
مجھ سے سنتا کوئی آشفتہ بیانی میری

زخم بھرنے کے لئے، داغ ہیں مٹنے کے لئے
نقش بر آب ہے ہر ایک نشانی میری

دست تائید پہ رکھے ہیں ادھر جام پہ جام
حرف انکار ادھر تشنہ دہانی میری

میں نے سو طرح سے، سو بار جتن کر دیکھا
اس نے اک بار مگر بات نہ مانی میری

اور پھر اب کے سخن کا وہ تقاضائے ہنر
اور پھر اب کے وہی ہیچ مدانی میری

○

(4)

پھول ہی پھول جو سینے پہ کھلائے ہوئے ہیں
ان دنوں ہم نگہ یار میں آئے ہوئے ہیں

اسی امید پہ ہم بھی کہ بر آئے گی امید
علم رفعت انکار اٹھائے ہوئے ہیں

ہے یہی منظر و ماحول تو دستار کی خیر
ہم ابھی عزت سادات بچائے ہوئے ہیں

عشق ہے یا کہ ہوس اہل نظر ہی جانیں
ہم تو اک موج بلا سر پہ اٹھائے ہوئے ہیں

یہ جو اشعار بہ اصرار لکھے ہیں ہم نے
ایک گنجینہ معنی کو چھپائے ہوئے ہیں

شام مہتاب غنیمت ہے نظارہ کرلو
صبح خورشید پہ اب ابر کے سائے ہوئے ہیں

○

(5)

باعث آزار و رسوائی میرے ساتھ ہے
پھر وہی دنیا وہی ہرجائی میرے ساتھ ہے

دل کی قیمت پر کیا ہے میں نے سودا عقل کا
اور سمجھتا ہوں کہ اب دانائی میرے ساتھ ہے

چھیڑ دیتی ہے کبھی تیرہ شبی میں دل کا ساز
اک گل تر کی ابھی رعنائی میرے ساتھ ہے

کس لیے میں ہوں اکیلا، کس لیے تنہا ہوں میں
خواہش یک انجمن آرا میرے ساتھ ہے

رنگ بازار تمنا اڑ گیا کب کا مگر
اس کی ساری زینت و زیبائی میرے ساتھ ہے

یہ سخن سازی، یہ شعر و شاعری، یہ کار شوق
جوہر یک جذبۂ یکتائی میرے ساتھ ہے

○

(6)

جب کچھ نہیں ملا اسے کھونے کے واسطے
جاگی ہے رات صبح کو سونے کے واسطے

بن کر لہو کی بوند ٹپکتا ہے حرف حرف
کاغذ پہ موتیوں کو پرونے کے واسطے

بس ایک یاد دل کی پذیرائی کے لئے
کافی ایک غم ہمیں رونے کے واسطے

دریا دلی سے ہو گئے سب مسئلے تمام
کشتی ہی اب کہاں ہے ڈبونے کے واسطے

دل کے معاملات بگڑتے چلے گئے
بس ایک سانولے سے، سلونے کے واسطے

دل ڈوبنے لگا ہے کہ پھر آ رہی ہے رات
خاک وطن لہو میں بھگونے کے واسطے

مہتاب تم بھی اوڑھ کے چادر کو سو رہو
ہوگا وہی لکھا ہے جو ہونے کے واسطے

○

عالم خورشید

غزل

اِدھر صفِ حریف ہے اُدھر صفِ حلیف ہے
کوئی ستم شعار ہے کوئی ستم ظریف ہے

سمجھ رہا ہوں خوب میں فریب چال کو مگر
مرے لبوں پہ صرف اک تبسمِ خفیف ہے

سخن کے ساتھ زہر بھی خوشی سے پی رہا ہوں میں
کہ جام تلخ ہی سہی زباں مگر لطیف ہے

بھلے ہی شاخ شاخ پر ہرے بھرے ہوں برگ و بر
مگر کٹے گا وہ شجر جو اک ذرا نحیف ہے

نئے معاشرے نے کچھ نئے مکاں بنائے ہیں
وہاں مکیں ہے صرف وہ جو فرد اب ضعیف ہے

ہنسوں گا جرم کر کے میں، ملیں گے تخت و تاج بھی
سزا ملے گی اب اسے جو شخص بھی عفیف ہے

کسی پہ ہو نہ ہو اثر مگر تجھے تو ہے خبر
ترا لباس پاک ہے ترا بدن کثیف ہے

رذالتوں کی وحشتیں اسی لیے ہیں ہر طرف
گھروں میں ہے چھپا ہوا جو آدمی شریف ہے

رواں دواں زمین میں غزل کہی تو ہے مگر
بجھے بجھے ہیں قافیے، تھکی تھکی ردیف ہے

○

غزل

خوشی ہوئی کہ زمانے میں کامیاب ہوئے
مگر جو اچھے تھے وہ یار بھی خراب ہوئے

زیاں کو سود لکھا، سود کو زیاں لکھا
سو گوشوارے میں سارے غلط حساب ہوئے

عجب عجب سی امیدیں تھیں ہم سے وابستہ
نہ آفتاب ہوئے ہم نہ ماہتاب ہوئے

یقین ہوتا نہیں ہے کبھی بُرے اعمال
ہماری مجلسوں میں وجہ انتخاب ہوئے

ضرور آب و ہوا میں ہوئی ہے تبدیلی
عجیب رنگ کے اب کے گُل و گلاب ہوئے

نظر جو آتے تھے پہلے ہرے بھرے اشجار
خیال خواب تھے شاید خیال و خواب ہوئے

تمہارے خواب حقیقت میں ڈھل گئے ہیں کیا
جو ہم نے دیکھے تھے وہ خواب تو عذاب ہوئے

جو کرتے رہتے تھے سیراب اپنے پیاسوں کو
سنا ہے سارے سمندر ہی اب سراب ہوئے

سنہرے حرفوں میں لکھے گئے تھے جو اوراق
نئی کتاب میں عالم سیاہ باب ہوئے

○

احمد محفوظ

غزلیں

(1)

خبر سنتے تو ہیں اس سنگ دل کے دل میں آنے کی
خدا معلوم کیا صورت بنے آئینہ خانے کی

نہ جانے خاک ہو جانے کی لذت کب میسر ہو
ابھی تو ایک مدت سے ہے خدمت خاک اڑانے کی

زمین و آسماں کچھ ہوں تو ہو پستی بلندی بھی
یہاں تو روز کیفیت بدلتی ہے زمانے کی

سہارا عشق زور آور نے خود ہی دے دیا ورنہ
کہاں ہم اور کہاں طاقت یہ کوہ غم اٹھانے کی

فنا آہنگ شاید ساز ہستی سے برآمد ہو
کہ آتی ہے صدا تار نفس سے جھنجھنانے کی

○

(2)

کسی کا عکس بدن تھا نہ وہ شرارہ تھا
تو میں نے چشمۂ شب سے کسے پکارا تھا

کہاں کسی کو تھی فرصت فضول باتوں کی
تمام رات وہاں ذکر بس تمھارا تھا

اسی کو بار دگر دیکھنا نہیں تھا مجھے
میں لوٹ آیا کہ منظر وہی دوبارہ تھا

سبک سری سے گرانی عجب ہوئی دل پر
ہے اب یہ پوچھ کہ وہ بوجھ کیوں اتارا تھا

شب سیاہ سفر یہ بھی رائیگاں تو نہیں
وہ کیا ہوا جو مرے ساتھ اک ستارہ تھا

○

(3)

اس سے رشتہ ہے ابھی تک میرا
وہ علاقہ ہے ابھی تک میرا

کس توقع نے جگایا تھا مجھے
خواب تازہ ہے ابھی تک میرا

کیا بتاؤں میں لب دریا سے
کچھ تقاضا ہے ابھی تک میرا

کہیں یک دشت ہوا چمکی تھی
شہر اندھا ہے ابھی تک میرا

اک ذرا خود کو سمیٹوں تو چلوں
کام پھیلا ہے ابھی تک میرا

وہی ٹوٹی ہوئی کشتی اپنی
وہی دریا ہے ابھی تک میرا

وہی صحرا ہے وہی رنج سفر
وہی قصہ ہے ابھی تک میرا

○

(4)

بدن سراب نہ دریائے جاں سے ملتا ہے
تو پھر یہ خواب کنارہ کہاں سے ملتا ہے
یہ دھوپ چھاؤں سلامت رہے کہ تیرا سراغ
ہمیں تو سایۂ ابر رواں سے ملتا ہے
ہم اہل درد جہاں بھی ہیں سلسلہ سب کا
تمھارے شہر کے آشفتگاں سے ملتا ہے
جہاں سے کچھ نہ ملے تو بھی فائدے ہیں بہت
ہمیں یہ نقد اسی آستاں سے ملتا ہے

○

(5)

رات تو بیت چکی پھر بھی نشہ طاری ہے
کیا کوئی کشمکش خواب و خبر جاری ہے
کیوں نہ سرشار کرے ساز خموشی مجھ کو
مست ہوں جس سے وہ نشہ مری ناداری ہے
باغ امکاں کوئی پردہ ہے کہ جس کے اوجھل
ایک ہی گل ہے یہاں جس کی مہک ساری ہے
اک زیاں جان کا ہوتا تو کوئی بات نہ تھی
اس سے ملنے میں کئی طرح کی دشواری ہے

○

اے نصیب خاں

نظمیں

(1)

ذریت اب الو کی قتل ہوگی روز و شب

رات خواب میں دیکھا
گور میں غریباں کی آبنوسی قبریں کچھ
بندشوں کی حد میں ہی کروٹیں بدلتی ہیں
سوختہ بدن کتبے ہیں خمیدہ سے پنجر
ماہ و سال آتے ہیں اور سرخ ناخن سے
نام ہوں کہ تاریخیں سب نقوش کتبوں کے
یوں کھرچ کے جاتے ہیں جیسے بیر ہو کوئی
سوختہ بدن کتبے لوح سادہ سادہ اب
کٹ گئے ہیں قبروں سے
بس پلک جھپکتے ہی منظر اک بدلتا ہے
سوختہ بدن کتبے لگ رہے ہیں یوں جیسے
آج گمشدہ صوفی گھر کو لوٹ آئے ہیں

اور کھڑے ہیں چوکھٹ پر
ہاتھ پاؤں میں رعشہ پھڑ پھڑاتی ہیں پلکیں
بال سب کی داڑھی کے رینگتے ہیں قبروں پر
اور مضطرب آنکھیں عالم خجالت میں
ڈھونڈتی ہیں ناموں کو اور نشانیاں ساری
پنجتن کے صدقے میں کچھ چراغ نورانی
جل رہے ہیں سرہانے
اک دبیز سا پردہ درمیاں میں حائل ہے
مضطرب نگاہیں اب دیکھنے سے قاصر ہیں
سیملوں کے سایے میں دم کو سادھے بیٹھا ہوں
اور آپ بیتی اب پانیتی کی سنتا ہوں
''بات ہے یہ برسوں کی چاہتوں کے موسم کی
رحمتوں کی بارش کی''
پانیتی یہ کہتی ہے
''گورکن کے ہاتھوں نے
جب دلارا تھا مجھ کو تھپکیاں لگائی تھیں
نیند میٹھی میٹھی سی ایک دم سے آئی تھی
بعد فجر ہی لیکن
اک دبیز سر میری ایڑیوں سے ٹکرایا
تھا پڑوس میں کوئی ہم سفر نیا آیا
کھردرا بدن مینڈک ساتھ ساتھ در آیا
اور لپٹ گیا مجھ سے جان وار تا مجھ پر
تھی عجیب دوپہری
ناگوار آندھی میں دامنی دمک اٹھی
ابر ٹوٹ کر برسے

کھردرا بدن مینڈک بھیگتا رہا دن بھر
اور شام ہوتے ہی بس اتر گیا جل میں
رہ گئی اکیلی میں
بتیاں اگر کی کچھ جل رہی ہیں سرہانے
کیا کروں میں سرہانا کچھ خفا سا رہتا ہے
جب کبھی بھی سینے میں دم سا گھٹنے لگتا ہے
منحنی شگافوں سے دیکھ لیتی ہوں دنیا
چیل پر شکستہ کچھ نیولے بپھرتے ہیں
جست وخیز میں چوہے رات دن بھٹکتے ہیں
بلّیاں فصیلوں پر روز وشب جھگڑتی ہیں
شورزار مٹی ہے گل رہے ہیں تلوے اب
کھردرا بدن مینڈک
پانیوں کی دنیا میں راز اگل نہ دے میرے"
پانیتی سسکتی ہے سوچتی ہے کہتی ہے
ڈالیوں سے برگ گل ناگہاں برستے ہیں
نیند ٹوٹ جاتی ہے"
آؤ بھائی آؤ تم بولو خواب کیا دیکھا
"گور میں غریباں کی آبنوسی قبریں کچھ...."
خواب میں نے دہرایا
"کوربین چیلیں کچھ اور مچھلیاں گونگی
سانپ کچھ بنا پھن کے نذر ہوں گے خنکی کی
اور درونی سوزش کی
دمچیاں پرندوں کی ہاتھیوں کے ناخن اب
بام ودر کی آنگن کی ہوں گے شہر کی زینت"
بوڑھا سوچ کر بولا

''آشنا فصیلوں پر ذریت اب الو کی
قتل ہوگی روز و شب
پیٹھ پیچھے دنیا کے عاملوں کے جنوں سے
کون جانے کتنے ہیں اور معاہدے باقی !''
نوح کے سفینے میں صرف جانور ہوں گے

○

(2)

رات خواب میں دیکھا

''پیپل اور برگد میں جھولتے ہوئے جھولے
نرم نرم ہونٹوں پر بول میٹھی کجری کے
ساونی ابھرتی ہے
چاند رقص کرتا ہے آب جو کی بانہوں میں
شاخساروں پر چڑیاں جھومتی ہیں گاتی ہیں
بادل آسمانوں سے لہلہاتے
دھانوں کی دید کو اترتے ہیں
اور چمکتی ہیں آنکھیں
مینہ پڑنے لگتا ہے
گھاگ بکریاں ساری لوٹتی ہیں پشتوں پر
بھیگتی ہیں پانی میں
بال سب کی داڑھی کے اور کشیدہ تھن سارے
آب و گل میں ہیں لت پت
دودھ رستا جاتا ہے

اور کسان کھیتوں میں جھر جھری سی لیتے ہیں
ڈھانپتے چھپاتے ہیں کم لباس جسموں کو
بارشوں کی یورش میں
چولہے تنے مٹی کے ٹوٹتے بکھرتے ہیں
اور کوزے مصری کے گل رہے ہیں ہاتھوں میں
زور بادوباراں کا بڑھ رہا ہے اب پیہم
سانپ گرسنہ سارے مچھلیاں بھی روپہلی
پرحذر ہیں دریا سے بطن سے زمینوں کی
آگہی کے جامے سب پیرہن تفکر کے
واہموں کی بے باکی پیچ وتاب منطق کے
مور پر کٹے کتنے زین بستہ گھوڑے سب
اور پرندے خشکی کے سطح آب بہتے ہیں
بس فصیل مٹی کی رازدار خلقت کی
شاہ تیر دھنی کی ایک چھت کے سائے میں
خشک ہونٹوں کو تھامے انتظار کرتی ہے
اب اچھلتے پانی کا سرسراتے اکھوں کا
چھپکلی کنواری اک آڑے ترچھے کھوکھل میں
چاٹتی ہے چھلکوں کو منحنی سے انڈوں کے
سیل آب کی شورش ہے عجیب اندیشہ
''رہ گئے کہاں بچے'' سوچتی ہے ڈرتی ہے
اور دراڑ میں الجھی دم کو توڑ دیتی ہے
دم ہے کہ تڑپتی ہے ڈھونڈھتی ہے تن اپنا
لال سرخ سی بلی اک نڈھال کونے میں
زار زار روتی ہے درد ہے ولادت کا
ذریت ہے بلی کی مونچھ باختہ یکسر

اور دم ہیں استادہ ڈولتی نہ ہلتی ہیں دسترس سے ہیں باہر
ہے بخار برساتی ہو کتے ہیں الو کچھ
مختصر سی دم والا گرگٹ اک جہاں دیدہ
دوش پر روانی کے اور ہمکتے پانی کے
ضبط و حوصلہ تھامے
مرحلے مسافت سے دور خود سے بہتا ہے
اور ابلتی آنکھوں سے ناپتا ہے پہنائی
ناتمام جہتوں کی منتظر خلاؤں کی
دور دیو قامت سی کانپتی عمارت پر
فاختائیں صدقوں کی اور کمہار کی بیٹی
اینٹ اور گارے کی کشتیوں میں بیٹھی ہیں
اور بپھرتے پانی میں
گاگرا ایک کچی سی ہے یتیم کی کشتی
کھا رہی ہے ہچکولے
راگ ہیں کہ شہوانی گونجتے ہیں ساحل پر
ابن نوح نشے میں سرخ آگ میں سوزاں
جسم و جاں ابلتا ہے
دور جبل جودی پر شادیانے بجتے ہیں
نیند ٹوٹ جاتی ہے"
آؤ بھائی آؤ تم بولو خواب کیا دیکھا
"پیپل اور برگد میں جھولتے ہوئے جھولے..."
خواب میں نے دہرایا
"ندیوں کے بگلوں کی اونٹ پر سواری ہے
بھوت ہیں مغیلاں کے ریگزاروں میں پھیلے
دیوتا ہیں محلوں کے پنکھ فاختاؤں کے مور اور ہریل کے

پیرہن میں ٹانکیں گے"

بوڑھا سوچ کر بولا

"ہے چڑھاؤ پر دریا

پانیوں کے سوتے ہیں پھوٹتے زمینوں سے

دھاردار بارش اب آسمان اگلے گا

پل صراط راہوں میں ہاتھوں میں عصا ہوں گے

پیچ دار ندیاں اب راستہ نہیں دیں گی

طرّہ دار پگڑی کو اوڑھنی اور اچکن کو

جانا ہوگا پل سے ہی

نوح کے سفینے میں صرف جانور ہوں گے..."

○

جمال اویسی

نظمیں

(1)

راہ نجات

انساں کے بڑھتے بوجھ سے گھبرا کے اے زمیں
راہ فرار کے لئے نکلی ہے تو کہاں
سیارگاں کے بیچ سے رستہ نکال کر
اور آخری کنارے چلی جائے گی جہاں
سورج کی اک کرن بھی تعاقب نہ کر سکے
اور ماہتاب چشم تحیّر لئے ہوئے
نکلے تری تلاش میں، لیکن نہ تو ملے
سینے سے آسمان کے تیرا فراریوں
ہوگا اسی طرح کہ سمندر کی تہہ کا سیپ
خود اپنی کوششوں سے نہ باہر نکل سکے
امواج تہہ بہ تہہ کی گرفت اس پہ سخت ہے

باندھی گئی تھی تو کبھی نا کردہ جرم میں
اب گردش مدام سے گھبرا گئی ہے تو
دہشت زدہ ہے پھیلے ہوئے لامکان سے
گر چاہتی ہے ختم ہو یہ رقص کائنات
اک راستہ نجات کا بچتا ہے بس یہی
سیارچہ گرے کوئی اور تجھ کو توڑ دے
یا تو ابلتے کھولتے سورج سے جا ملے

○

(2)

نزول

نہ جانے کتنے جنگل اور صحرا مجھ میں اتریں گے
ابھی اک بحر بے پایاں ہمکتا ہے مرے اندر
خلا سے ٹوٹ کر گرتے ستاروں کا امیں بن کر
مجھے دہشت زدہ کرنے بہت سے اجنبی آئے
مگر سب قلب میں میرے سما کر دوست بن بیٹھے
یہ ہفت افلاک بھی اپنی بلندی سے اگر اترا
تو مجھ پر ہی یہ اترے گا

○

رباعیاں

(1)

پیمانہ ترا کیا ہے بشر یا کچھ اور
تعئین بقا، نقد و نظر یا کچھ اور
افشاء ہے مرے سامنے ہر راز حیات
کرنا ہے مجھے زیر و زبر یا کچھ اور

(2)

تو مجھ سے تہی اور بنا لے دنیا
رکھ اس میں کسی اور کا مرکز چہرا
ہاں دیکھ نہ رکھ اس میں مرا وصف کوئی
پھر سوچ کمی رہ گئی اس میں کیا کیا

(3)

اس درجہ مصائب میں سکوں کرتے ہوئے
کس طور سے جیتا ہوں جنوں کرتے ہوئے
شاید تجھے معلوم نہیں شاہد وقت
خود کو تہ حالات زبوں کرتے ہوئے

(4)

اے لیل و نہار سلسلہ تیرا دراز
آنکھیں ہیں مری روز ازل سے ہمراز
آواز مجھے دیتے ہیں گزرے ہوئے لوگ
پھیلا ہوا صدیوں کا سفر بے انداز

(5)

اردو ادب اک طرز تعلی ہے میاں
یہ کام کے افکار سے مخفی ہے میاں
ہے سر بہ سر افراد کا انبوہ عظیم
ہر آدمی اس فوج کا ہادی ہے میاں

○

معراج رعنا

غزلیں

(1)

میں خواب دیکھ نہ لوں اس خطر سے پہلے مجھے
جگا دیا ہے کسی نے سحر سے پہلے مجھے

ہوا میں اڑنا تحیر نہیں مرے نزدیک
ہنر یہ آتا تھا تیرے ہنر سے پہلے مجھے

رہِ جنوں میں نہ صحرا ملا نہ دیوانے
بہت ڈرایا گیا تھا سفر سے پہلے مجھے

میں اک چراغ مری لو فضا میں چاروں طرف
ہوا کی مرضی بجھائے جدھر سے پہلے مجھے

جو گھر کا رنگ ہے وہ میرے دل کا ہو جاتا
اگر وہ دیکھتا دیوار و در سے پہلے مجھے

جہاں تہاں سے سنانا پڑا اسے معراج
طویل قصہ شبِ مختصر سے پہلے مجھے

(2)

میرے بکھراو سے ممکن ہوئی یکجائی مری
باعثِ بزم ہے سچ پوچھیے تنہائی مری

اس کو آئینہ مجھے چہرہ نظر آتا ہے
اس کی بینائی سے ملتی نہیں بینائی مری

قتل کے بعد اگ آیا میں مثالِ گلِ تر
رنگ لانی تھی سو لے آئی شکیبائی مری

نقش معدوم میں پرنور ہے موجود مرا
یعنی اک دنیا ابھی تک ہے تمنائی مری

ایک ہنگامہ بپا ہے پسِ خلوت معراج
آ ادھر دیکھ کبھی انجمن آرائی مری

○

سرورالہدیٰ

نظمیں

کمی ہے مجھ میں بہت قوت ارادی کی

کمی ہے مجھ میں بہت قوت ارادی کی
یہ بات کس نے کب کہی نہیں معلوم
نہ جانے کب سے یہ احساس دل دکھاتا ہے
نہ جانے کب سے یہ احساس جگمگاتا ہے
یہ مجھ میں کون چھپا ہے جو میرا ہو نہ سکا
جسے میں غیر سمجھتا ہوں میری ذات نہ ہو
جسے میں اپنا سمجھتا ہوں میرا غیر نہ ہو
یہ ہونے اور نہ ہونے کا سلسلہ کیا ہے
یہ مجھ میں کون چھپا ہے کہ جس کے ہونے سے
قرار دل کو ہے حاصل نہ بے قراری ہے
مگر یہ جنگ مسلسل ہے اور جاری ہے
دھواں سا اٹھتا ہے لیکن کہیں دھواں تو نہیں
سنا تو تھا کہ دھواں لوٹ کر نہیں آتا
یہ کیسی شے ہے جو پھرتی ہے اب نگاہوں میں
دھواں کو دھند بھی کہتے ہیں
اور نہیں کہتے
دھوئیں میں شکل جو پھرتی ہے

وہ دھواں تو نہیں
اک ایسی شکل جو دل سے ذرا مشابہ ہے
وہ ایک فیصلہ عجلت میں ہو گیا تھا کبھی
وہ فیصلہ جسے ہونا تھا سرخرو اک دن
وہ دن تو آ بھی چکا رات کی سیاہی میں
کمی ہے مجھ میں بہت قوت ارادی کی
میں مانتا ہوں مگر تم کو کون سمجھائے
ہے ایک اور بھی قوت جو خامشی کی ہے
ہے ایک اور بھی طاقت
جو چھپ کے بیٹھی ہے
سخن کی آخری صف میں
سخن کی شدت میں
جو قوتیں مجھے حاصل ہیں
ان کے بارے میں
جو کچھ کہوں بھی تو پھر خامشی در آئے گی
یہ بات کس نے کہی کب کہی نہیں معلوم
نہ کوئی غیر ہے میرا نہ کوئی اپنا ہے
جو کچھ کہوں تو وہ کچھ اور بولنا چاہے
کہیں چلوں تو وہ صدیوں کا فاصلہ چاہے
یہ مجھ میں کون چھپا ہے جو میرے ہونے سے
کبھی تو خوش ہے بہت اور کبھی ہے خوف زدہ
مگر اسی سے مسلسل ہے گفتگو جاری
یہ میری ذات کا ہے غیر یا کہ ذات مری
یہ کیا ضرور کہ اس کو بھلا سا نام بھی دیں
یہ لفظ غیر بھی کتنا عجیب لگتا ہے

غیاب جس کو سمجھتے ہیں کوئی غیر نہ ہو
یہ فلسفہ ہے کوئی یا کوئی کہانی ہے
یہ اس کے اور مرے ہونے کی نشانی ہے

○

کتابوں کی پھیلتی ہوئی دنیا

کتابوں کی بڑھتی اور پھیلتی ہوئی دنیا
زندگی کی تنگی کا احساس دلاتی ہے
کتابوں کی بڑھتی اور پھیلتی ہوئی دنیا
کچھ اور وقت کا تقاضا کرتی ہے
وہ وقت بھی جو گزر چکا ہے
جو گزر رہا ہے
جسے گزرنا باقی ہے
کتابیں پریشانی کا سبب بن جاتی ہیں
ان کے لیے جنہیں پڑھنا نہیں ہے
اور ان کے لیے بھی جنہیں سمجھنا نہیں ہے
ان کے لیے بھی جو صرف ایک کتاب پڑھنا چاہتے ہیں
صرف ایک کتاب لکھنا چاہتے ہیں
وہ کتاب بھی کہاں پڑھی جا سکی
وہ ایک کتاب کہاں لکھی جا سکی
یہاں کتابیں کتنی خاموش ہیں
الگ الگ وقتوں میں ان کی گویائی کا احساس ہوتا ہے
آنکھیں ایک نظر میں کتنی کتابیں دیکھ سکتی ہیں
کوئی کہتا تھا

کوئی کہتا ہے
کتابوں سے خوف آتا ہے
نیند اڑ جاتی ہے
زندگی مشکل ہو جاتی ہے
خوف میں جینا
خوف ہر شخص کا مقدر بھی کہاں ہے
خوف کی دنیا میں کتنے امکانات پوشیدہ ہیں
حیرتوں کے
آزمائشوں کے
اب کوئی خوفزدہ ہے اور نہ حیران
کچھ کتابیں شرمندہ ہیں ایسی کتابوں کے ساتھ
جو کاغذ پر بکھری ہوئی سیاہی
کا سیاہ باب ہیں
کتابیں اشکبار ہیں
پرانی کتابوں کی مرہم پٹی کرتے ہوئے
انگلیاں لہولہان نہ سہی کچھ سیاہی مائل ہو گئی ہیں
یہ سیاہی لہولہان دنیا سے تحریک پا کر وجود میں آئی ہے
وہ کتابیں بھی شرمندہ ہیں جنہیں زیادہ اہمیت دی گئی
ایسی کتابیں یہاں کیسی آ گئیں
کتابیں خاموش ہیں
وہ کتابیں جو پرشور کتابوں سے گریزاں ہیں
ایسی کتابیں یہاں کیسے آ گئیں
کتابیں کتنی گویا ہیں
گویائی اور خاموشی
مل کر خاموش گوئی کا تاثر پیش کرتی ہیں

کچھ کتابوں سے گزرے ہوئے وقت اور آنے والے وقت
کے درمیان مکالمے کا احساس ہوتا ہے
وہ وقت جو کتابوں کے اندر ہے
اور جو کتابوں سے باہر ہے
کوئی وقت ایسا بھی ہو جو نہ کتابوں کے اندر ہو اور نہ کتابوں سے باہر
وہ کتابیں جو سرہانے رکھی ہیں
انہیں اب اپنی جگہ پر پہنچا دینا چاہیے
کتابوں کا تکیہ ذہن کو کتنا منتشر کر دیتا ہے
کتابوں کی سختی
ذہن کی سختی کے ساتھ
کتنی نرم اور اداس ہو سکتی ہے
سرہانے رکھی ہوئی کتابیں
دن میں نہ جانے کہاں غائب ہو جاتی ہیں
شام ہوتے ہی مفلس کے چراغوں کی طرح ان کا روشن ہو جانا
یہ کیسی مفلسی ہے
کتابوں کی بڑھتی اور گھٹتی ہوئی تعداد
کسی کو کسی کی خبر نہیں
مصنف خوش ہے کہ اس کی کتاب یہیں کہیں رکھی ہے
کتاب رکھی تو ہو لیکن پڑھی نہ جائے
یہ کیسا خوف ہے
مجھے اس خوف سے ہمدردی ہے
خوف ان کتابوں سے ہے جو سرہانے رکھی ہیں

○

دانیال کی چھوٹی اور معصوم انگلیوں میں

دانیال کی چھوٹی اور معصوم انگلیوں میں
کتنی کتابوں کے پرزے پوشیدہ ہیں
ہر دن وہ کسی کتاب کا انتخاب کرتا ہے
یہ پرزے کتابوں کے ہیں مصنف کے تو نہیں
ان معصوم انگلیوں میں کتنے معنی پوشیدہ ہیں
کتابیں بکھرنے سے پہلے اور بکھرنے کے بعد معنی کے سلسلوں کو ایک چھوٹی سی مٹھی میں بند کر دیتی ہیں
معصومیت جمود کے لیے خطرہ بن جاتی ہے
غصہ زیادہ ہے یا سرشاری
سرشاری زیادہ ہے یا غصہ
بس ایک سلسلہ ہے ہر روز کتابوں کے بکھرنے کا
موبائل کو چھپانے کی اتنی بڑی قیمت
کتابوں کو چھپانے کی کوئی صورت نہیں
آج ہرمن واک کی the winds of war کی باری تھی
یہ ہوائیں دوسری جنگ عظیم کی تھیں
چند دن ہی تو ہوئے تھے
نیند سے بوجھل آنکھوں نے اپنی تھکن کا احساس دلایا
دانیال نے ایک چھوٹے سے کمرے میں
دوسری جنگ عظیم کی ہواؤں کا کچھ ایسا مذاق اڑایا
جنگ کی ہوائیں زمانے کو عبور کرتی ہوئی
کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہیں
انہیں تعبیر کے کن مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے

ایک وہ ہوا بھی تھی
جو ہجرت اور تقسیم کی تھی
کتنی تیز ہوا تھی
کچھ سنائی نہ دیتا تھا
ابوالکلام قاسمی کی اس تعبیر میں تاریخ کا عمل تھا
اس کا ادراک خلیل الرحمٰن اعظمی کو ہوا تھا
گزشتہ رات بہت تیز چل رہی تھی ہوا
صدا تو دی پہ کہاں تک تمہیں صدا دیتے
ہوا کی تیزی کا احساس باقی ہے
کتاب کہ پرزوں نے فضا میں اس کی موجودگی کا احساس دلایا
کتاب کے پرزے ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں
دانیال آج کتنا خوش ہے
جنگ کی ہواؤں کا سلسلہ شاید کچھ اس طرح تھم جائے
وہ پرزے کچھ اس طرح جمع کر رہا ہے
جیسے انہی سے کوئی نئی کائنات بن جائے گی
چھوٹی چھوٹی انگلیاں پرزوں کو جمع کر رہی ہیں
کبھی وہ پرزوں کو اڑا دیتا ہے
اس کی مٹھی میں پرزے کچھ یوں جمع ہو جاتے ہیں کہ
جیسے معنی تھک ہار کر اب یہیں رہنا چاہتے ہوں
چھوٹی ہتھیلی اور مٹھی کی بساط کتنی بڑی ہے

○

لہو کس کا کہاں کتنا بہا ہے

یہ جو مشرق کا ملبہ دیکھتے ہو
یہ اونچا اور اونچا ہو رہا ہے
ہے کچھ حقدار تو مغرب بھی اس کا
اسی کو بھیج دو ملبہ اٹھا کر
مگر ملبہ تو مشرق کی علامت بن گیا ہے
''سبا ویراں، سلیماں سر بہ زانو''
یہی مشرق کا اب ہے استعارہ
یہی تو پہلے بھی تھا استعارہ
وہ تھا راشد کا مشرق
اور یہ مشرق ہے میرا
''سبا ویراں سلیماں سر بہ زانو''
یہ جو صدیوں کی ویرانی ہے مجھ میں
یہ جو کھنڈرات میری ذات کے ہیں
کوئی آواز کب سے دے رہا ہے
کھنڈر ملبہ سے پہلے کی ہے منزل
یہاں تک آنے میں صدیاں لگی ہیں
جسے کہتے ہو تم مشرق کا ملبہ
تمہاری غفلتوں کا ہے نتیجہ
تم اپنے بارے میں کب تک یہی کہتے رہو گے
ذرا ان سازشوں کو بھی تو دیکھو

یہ کوئی حل نہیں ہے مسئلے کا
یہ کہہ دینا ہی تو کافی نہیں ہے
کہ مشرق ہارتا جاتا ہے کب سے
تو کیا مغرب کبھی ہارا نہیں ہے
فقط مشرق ہی بیچارہ نہیں ہے
وہ جو مغرب میں ملبہ دیکھتے ہو
وہاں بھی زندگی دب سی گئی ہے
لہو کس کا کہاں کتنا بہا ہے
مگر ملبہ کا رنگ یکساں نہیں ہے
یہ کہہ دینا بھی تو کافی نہیں ہے
اسی ملبے کے اوپر اک نئی تعمیر ہوگی
اسی ملبے سے اک دنیا بنے گی
سیاست اب فقط ملبہ کی باقی رہ گئی ہے
یہ ملبہ کیا کسی تعمیر کا ہے
یہ ملبہ اب کسی تخریب کا ہے
سنا ہے جنگ کی تاریخ جو ہے
وہی ملبے کی بھی تاریخ ٹھہری
وہی ملبے کی بھی تہذیب ٹھہری
''سباویراں سلیماں سر بہ زانو''
تمہارے حافظے کی آخری منزل یہی ہے

○

سلیم سہیل

غزلیں

(1)

دوسرے کنارے سے یوں پکارنے والے
کون تیری خاطر اب اِس طرف دیا بالے

روشنی غضب اُجلی جیسے تیرا چہرہ ہو
ساتھ ساتھ چلتے ہیں سائے بھی بہت کالے

کون ہے جو آئے گا، اب کوئی نہیں آتا
دل کے در پہ پھیلے ہیں مدتوں سے یہ جالے

گم ہوئے ہیں خود ہم بھی اور وہ بھی گم شاید
گم رہی کے ہم نے بھی روگ یہ عجب پالے

وقت کے ٹلانے کے یوں تو سو بہانے ہیں
جھریوں کو چہرے کی کوئی کس طرح ٹالے

عقل سے ہیں پیدل بھی، جہل میں مکمل بھی
ایسے خود پرستوں سے واسطہ نہ رب ڈالے

تجھ کو ہوش آئے گا اے سہیل اس لمحے
اس گلی میں جا کر جب جان کے پڑیں لالے

○

(2)

نقش ہے دل پہ چار سو تیری پھبن تیری مہک
یاد میں کھب چکی مری تیری ادا تری بھڑک
ساتھی سبھی چلے گئے ، شہر ہے خامشی میں گم
خواب نما یہ چاندنی، خالی پڑی ہوئی سڑک
تھوڑی سی اک امید پر میں نے بڑھائے ہیں قدم
وقت بہت رہا ہے کم تو نہ اب اس قدر جھجک
اور تو کچھ بچا نہیں بازیِ عشق ہار کے
خون کی ایک بوند سی دل میں کہیں گئی اٹک
کوئی نہیں ہے اب یہاں ہم نفس ہو یا ہم قدم
ویراں پڑے ہیں کوہ و دشت ان میں نہ رات دن بھٹک
پھر اسی شہر کا خیال، تیری گلی کی وہ کشش
خوار و ذلیل ہو کے بھی دل میں ہے آج بھی کھٹک
تشنہ ہیں گوش اب تلک مدت ہوئی سنے ہوئے
لہجے سے جس کے تھی عیاں ایک عجیب سی لٹک
مجلسِ دوستاں سہی، مجمعِ دشمناں سہی
کہتا رہ تو یونہی غزل ہرگز نہ لمحہ بھر ٹھٹک
معرکۂ جہانِ نو ہے ترا منتظر سہیل
پچھلے رواج و رسم کو دامن سے آج دے جھٹک

○

(3)

اک خواب نظر میں رہنے دو، اک شور سا سر میں رہنے دو
تھوڑا سا اثاثہ اس میرے ٹوٹے ہوے گھر میں رہنے دو

کیا شعلہ صفت اک صورت ہے، کیا حسن کی جگمگ ہے ہر سُو
خِیرہ ہی سہی میں اس لمحے، یہ سحر نظر میں رہنے دو

سنتا ہی نہیں اب میری فغاں ویرانیِ عالم میں کوئی
اب دشت و جبل کی وحشت کو میرے ہی اثر میں رہنے دو

گو راکھ ہوا ہوں ہجرت میں اور پیاس بہت ہی بھڑکی ہے
خاکسترِ دل کو ساتھ لیے بے سُود سفر میں رہنے دو

دنیا کے سبھی بازاروں میں لٹنے کے قرینے ہیں کیا کیا
ہم جیسے فقیروں کی خاطر کچھ سُود ضرر میں رہنے دو

ساحل کے سکوں کی آڑ میں کیا دنیا کے بدلنے کے دعوے
آفات کا جُویا ہوں میں تو، سو بیچ بھنور میں رہنے دو

○

سید راغب اختر

(1)

منکر لفظ قم

دشت امکان میں
معصیت کی پہاڑی تلے
اک تعفن زدہ لاش
لاوارث و بے کفن
ایک مردہ دریدہ بدن
منکر لفظ 'قم'
اپنے اطراف کے
سارے عریاں مناظر کی
تحقیر کرتی ہوئی
چشم وا، منتہاؤں میں گم
کرگس وزاغ جاہ و حشم
جس کا عریاں بدن
نوچ لینے کے درپے ہیں
وہ کون ہے؟
کوئی دریوزہ گر؟
دزد اقلیم وزر؟
حیف کوئی نہیں
جرم اس کا فقط ہے یہی

کہ وہ اوصاف فقرات کو
ترک کرنے سے قاصر رہا

○

(2)

مفروضہ

ہوسکتا ہے
میرے منظر کے سارے پس منظر
بس کچھ دھندلے سائے ہوں
ہوسکتا ہے
میں جو کچھ بھی سوچ رہا ہوں
سب کچھ
بس اک بے ڈھنگا مفروضہ ہو
ہوسکتا ہے
میں نے جو تاریخ پڑھی ہے
اس کا ہر کردار
نہایت بودا ہو
لیکن اکثر سوچتا ہوں
میری فکر
مری تاریخ
مرا پس منظر
سب کچھ
اک مفروضہ ثابت ہو جائے تو...؟

○

معید رشیدی

غزلیں

(1)

کبھی آسمان پہ چاند تھا کبھی رات تاروں بھری رہی
میں شہیدِ جرم نگاہ تھا مرے ساتھ بے خبری رہی

ترے نام کا میں چراغ لے کے نکل پڑا تھا ہواؤں میں
نہ تو خوف تھا کبھی آندھیوں کا نہ فکرِ بخیہ گری رہی

کبھی دو گھڑی رخِ یار پر کبھی دو گھڑی رخِ دار پر
جو کیا حسابِ دل و جہاں تو کھلا کہ دربدری رہی

کوئی کاروبارِ نفس نہیں، کوئی کارزارِ ہوس نہیں
سو مزاجِ آئینہ ساز میں وہی خوئے شیشہ گری رہی

پسِ رازِ کن فیکوں ہے کیا، سرِ جستجو یہ جنوں ہے کیا
جو کیا سوال ازل کبھی تو صدائے پردہ دری رہی

جو خراب ہونا تھا دشت میں تو ہوا کے دوش پہ چل پڑے
کہ مریض عشق کے واسطے ، نہ دوا، نہ چارہ گری رہی

(2)

نم آنکھوں میں خواب لیے کچھ اپنے گھروں میں بیٹھے ہیں
کچھ اپنے مہتاب لیے تاریک زتوں میں بیٹھے ہیں

ظالم اور مظلوم کے سارے فرق مٹادیتی ہے رات
جن لوگوں نے قتل کیا تھا نوحہ گروں میں بیٹھے ہیں

جنگ میں لشکر پہلے اپنے اندر سے ہی ٹوٹے گا
گھات لگائے دشمن جب اپنی ہی صفوں میں بیٹھے ہیں

وقت کی زد پر جانے کب، کس وقت پلٹ جائے بازی
پتھر مارنے والے سارے شیشہ گروں میں بیٹھے ہیں

کل جو خنجر پار ہوئے سینوں میں اتر کر آہوں کے
آج وہ سارے خنجر جا کر چارہ گروں میں بیٹھے ہیں

(3)

جب للکارنے والا کوئی نہیں آئے گا
خنجر مارنے والا کوئی نہیں آئے گا

عشق میں جان لٹانے کا جذبہ ہی نہیں جب
جیون ہارنے والا کوئی نہیں آئے گا

شہر میں دیوانوں کی کوئی قدر نہ ہوگی
پتھر مارنے والا کوئی نہیں آئے گا

اپنی انا سے لڑ کر جنگ میں جیت گئے تم
تو پھر ہارنے والا کوئی نہیں آئے گا

میں ویرانے کو جا تو سکتا ہوں لیکن
ٹھوکر مارنے والا کوئی نہیں آئے گا

(4)

ایک نہ اک دن نفرت اپنا رستہ بدلے گی
پہلے ہم بدلیں گے پھر یہ دنیا بدلے گی

سر پر شعلوں کے بادل ہیں، دھرتی پر برسات
اِس برسات کے بعد قیامت چہرہ بدلے گی

جب طوفان گزر جائے گا سر کے اوپر سے
تب سیلاب کے بعد حکومت لہجہ بدلے گی

دن چڑھتے ہی اور ہی منظر ہوگا دنیا کا
یعنی راتوں رات سیاست خیمہ بدلے گی

صبح چراغ کے بجھتے ہی پھر قبلہ بدلے گا
پھر مقتل میں کوئی عبادت سجدہ بدلے گی

مجبوری میں جسم کا سودا بھی ہے مجبوری
مجبوری میں کوئی طوائف کاسہ بدلے گی

(5)

چراغ بجھ رہے ہیں قتل عام ہو رہا ہے
مناؤ جشن خدا سے کلام ہو رہا ہے

اسی کے نام پہ سب بستیاں جلائی گئیں
اسی کے نام پہ سب انتظام ہو رہا ہے

سب اپنے اپنے خداؤں سے کام لیتے ہیں
کس اہتمام سے نفرت کا کام ہو رہا ہے

ترے ہی نام پہ بندے لہو بہاتے ہیں
زمیں پہ دیکھ ترا کتنا نام ہو رہا ہے

اسے کہاں کسی زنجیر کے عذاب کا خوف
بصد خلوص جو تیرا غلام ہو رہا ہے

○

سالم سلیم

غزلیں

(1)

نہ چھین لے کہیں تنہائی ڈر سا رہتا ہے
مرے مکاں میں وہ دیوار و در سا رہتا ہے

کبھی کبھی تو ابھرتی ہے چیخ سی کوئی
کہیں کہیں مرے اندر کھنڈر سا رہتا ہے

وہ آسماں ہو کہ پرچھائیں ہو کہ تیرا خیال
کوئی تو ہے جو مرا ہم سفر سا رہتا ہے

میں جوڑ جوڑ کے جس کو زمانہ کرتا ہوں
وہ مجھ میں ٹوٹا ہوا لمحہ بھر سا رہتا ہے

ذرا سا نکلے تو یہ شہر الٹ پلٹ جائے
وہ اپنے گھر میں بہت بے ضرر سا رہتا ہے

بلا رہا تھا وہ دریا کے پار سے اک دن
جبھی سے پاؤں میں میرے بھنور سا رہتا ہے

نہ جانے کیسی گرانی اٹھائے پھرتا ہوں
نہ جانے کیا مرے کاندھے پہ سر سا رہتا ہے

چلو سلیم ذرا کچھ علاج جاں کر لیں
یہیں کہیں پہ کوئی چارہ گر سا رہتا ہے

○

(2)

جسم کی سطح پہ طوفان کیا جائے گا
اپنے ہونے کا پھر اعلان کیا جائے گا

ہم رہیں گے ابھی اس آئینہ خانے میں اسیر
ابھی کچھ دن ہمیں حیران کیا جائے گا

سامنے سے کوئی بجلی سی گزر جائے گی
میرے اندر کوئی ہیجان کیا جائے گا

منزل خاک پہ جانا ہے اسی شرط کے ساتھ
یہ سفر بے سر و سامان کیا جائے گا

آ رہا ہوگا وہ دامن سے ہوا باندھے ہوئے
آج خوشبو کو پریشان کیا جائے گا

○

(3)

صرف اک اس کے خفا ہونے سے
مجھ کو مطلب نہ رہا ہونے سے

زندگی موت سے مل پاتی نہیں
بیچ میں ایک خلا ہونے سے

شام بکھری ہے مرے دل کی طرح
تیری زلفوں کی ہوا ہونے سے

دل تو یوں راہ پہ آنے سے رہا
چار چھ دن کی سزا ہونے سے

کیا بگڑ جاتا ہے تیرا مرے یار
ہم غریبوں کا بھلا ہونے سے

اب بھی بندوں میں چھپے بیٹھے ہو
کیا ملا تم کو خدا ہونے سے

کیسی بھرپور عبادت کی ہے
کچھ نمازوں کے قضا ہونے سے

جگمگا اٹھتا ہے کمرا سارا
صورت آئینہ نما ہونے سے

○

(4)

آئنے میں کئی چہرے نظر آتے ہیں مجھے
رقص کرتے ہوئے سائے نظر آتے ہیں مجھے

ان کو محفل سے اٹھا لایا ہوں تنہائی میں
دیکھنا یہ ہے کہ کیسے نظر آتے ہیں مجھے

ایک تجھ کو ہی نہیں دیکھنے پاتی مری آنکھ
ہر طرف تیرے تماشے نظر آتے ہیں مجھے

اپنی منزل پہ پہنچنے کے لئے روز و شب
دوڑتے بھاگتے رستے نظر آتے ہیں مجھے

دیکھتا رہتا ہوں شہروں پہ دھوئیں کے بادل
اور اٹھتے ہوئے شعلے نظر آتے ہیں مجھے

○

(5)

اس طرح مت اپنی تنہائی کو ضائع کیجیے
اپنے عاشق کو ذرا گھر پر بلایا کیجیے

چھو کے کر دیجے ہمیں غائب جہان خاک سے
جو حقیقت ہے اسے اک دن کنایہ کیجیے

قتل کیجے شوق سے ہم کو سر بازار آپ
اور ہماری نعش گلیوں میں پھرایا کیجیے

آپ کی دہلیز پر بیٹھا ہوا راہی ہوں میں
اک ذرا گھر سے نکلیے اور سایا کیجیے

لفظ اور اظہار کے سارے وسائل آپ کے
اب ہمارے پاس جو کچھ ہے پرایا کیجیے

آپ کے آنے سے ہم آتے ہیں اپنے آپ میں
اک کرم کچھ ہمارے پاس آیا کیجیے

دھوپ کی شدت میں سارا حسن کمھلا جائے گا
کھولیے زلفوں کو اور چہرے پہ سایا کیجیے

○

فیضان الحق

نظمیں

(1)

محاسبہ

ہم بدنصیب لوگ
گھر بار چھوڑ کر
اپنی توقعات کی تھامے ہوئے لکیر
ماؤں کا کرب
باپوں کی تکلیف بھول کر
منزل کی جستجو کا ترانہ لیے ہوئے
جھوٹی ترقیوں کا بہانا لیے ہوئے
بے سمت بڑھ رہے ہیں
اور خواب بن رہے ہیں
ہر سانحے کا ہم پہ اثر ایک رات ہے
کل اور بات ہے
جو کچھ ہوا، برا ہوا، اس کا ملال ہے
ادنیٰ خیال ہے

پھر وقت بھی تو چل رہا کتے کی چال ہے۔۔۔۔!!
ہم کو ہماری خواہشوں کی ریت لے اڑی
زمیں سے پاؤں اٹھ گئے
فلک ہوا دھواں دھواں
ہماری ذات اپنے ہی غبار میں ہے پرفشاں
یہاں۔۔۔۔۔۔وہاں۔۔۔۔۔۔!!
ٹپک رہا ہے دل پہ روز
بوند بوند بن کے درد
اور ہم خموش ہیں۔۔۔۔۔۔!!
کہ پتھروں سے بھی الگ
ہے کوئی سخت مادہ
جو دل کا روپ دھار کے اتر گیا ہے جسم میں
نہیں ہوا ہے درد کا جسے گماں
جل رہے ہیں آستاں
سلگ رہے ہیں جسم و جاں
ہم کو اس کا ہوش ہے
ہم مگر خموش ہیں
دل سے سیہ پوش ہیں۔۔۔۔!!

○

(2)

تریاق

زمین ذات میں پھیلے اداسیوں کے درخت
مہیب راتوں میں کچھ ایسے سنسناتے ہیں
کہ میرے جسم میں سہرن سی ہونے لگتی ہے
فصیل چشم پہ اشکوں کا بے نوا لشکر
کسی سمندری طوفان سا امنڈتا ہے
کبھی کبھی تو یہ سرحد بھی لانگھ جاتا ہے
مگر کبھی کسی خاموش معجزے کی طرح
درون چشم ہی خود کو سمیٹ لیتا ہے
میں سوچتا ہوں کسی ٹھہرے اجنبی کی طرح
میں کس تلاش میں ہوں، کیا مری ضرورت ہے؟
یہ کس مقام پہ اپنا سفینہ پہنچا ہے؟
نظر میں دور تلک صرف پانی ہی پانی
میں گھر کی تنگ گزرگاہ سے نکلتے ہوئے
اداس چہرے کی آنکھوں کا نور لایا تھا
جسے نگل گیا ظلمت کا بے رحم افعی
ٹٹولتا ہوں میں اب اپنے خالی جیبوں کو
تمام اثاثہ مرا منتشر ہے راہوں میں
میں چاہتا ہوں ایسے وقت میں اک نظم لکھوں
وہ نظم جس میں اداسی کا کوئی حرف نہ ہو
مرے دماغ پہ ماضی مرا مسلط ہے

مری نگاہ میں بیٹھا ہوا ہے آئندہ
میں اپنے خواب کی تکمیل چاہتا ہوں اور
کوئی اداس سا چہرہ مجھے بلاتا ہے
میں چاہتا ہوں ایسے وقت میں اک نظم لکھوں
لکھوں کہ کیسے کسی خوب رو کی دلجوئی
اداسیوں کا یہ جالا سمیٹ دیتی ہے
مشام جاں میں نئی روح پھونک دیتی ہے
میں چاہتا ہوں ایسے وقت میں اک نظم لکھوں
عیاں ہو جس میں مری فکر کا نہاں خانہ
مرے حروف ہی اکثر مجھے مٹاتے ہیں
زبان مجھ کو نیا راستہ دکھاتی ہے
میں ایک لفظ 'اداسی' میں کیا چھپاتا ہوں؟!
میں چاہتا ہوں کہ اس وقت ایک نظم لکھوں!

○

کیدار ناتھ سنگھ

نظمیں

(1)

پانی میں گھرے ہوئے لوگ

پانی میں گھرے ہوئے لوگ
دعا نہیں کرتے
وہ پورے یقین سے دیکھتے ہیں پانی کو
اور ایک دن بغیر کسی اطلاع کے
خچر بیل یا بھینس کی پیٹھ پر
گھر اسباب لاد کر
چل دیتے ہیں کہیں اور
یہ کتنا عجیب ہے
کہ سیلاب چاہے جتنا بھیانک ہو
انہیں پانی میں
تھوڑی سی جگہ ضرور مل جاتی ہے
تھوڑی سی دھوپ
تھوڑا سا آسمان
پھر وہ گاڑ دیتے ہیں کھمبے

تان دیتے ہیں بورے
الجھا دیتے ہیں مونج کی رسیاں اور ٹاٹ
پانی میں گھرے ہوئے لوگ
اپنے ساتھ لے آتے ہیں پوال کی خوشبو
وہ لے آتے ہیں آم کی گٹھلیاں
خالی ٹن بھنے ہوئے چنے
وہ لے آتے ہیں چلم اور آگ
پھر بہہ جاتے ہیں ان کے جانور
ان کی پوجا کی گھنٹی بہہ جاتی ہے
بہہ جاتی ہے مہاویر جی کی آدم قد مورتی
گھروں کی کچی دیواریں
دیواروں پر بنے ہوئے ہاتھی گھوڑے
پھول پتے
پاٹ پٹورے
سب بہہ جاتے ہیں
مگر پانی میں گھرے ہوئے لوگ
شکایت نہیں کرتے
وہ ہر قیمت پر اپنی چلم کے چھید میں
کہیں نہ کہیں بچا رکھتے ہیں
تھوڑی سی آگ
پھر ڈوب جاتا ہے سورج
کہیں سے آتی ہیں
پانی پر تیرتی ہوئی
لوگوں کے بولنے کی تیز آوازیں
کہیں سے اٹھتا ہے دھواں

پیڑوں پر منڈلاتا ہوا
اور پانی میں گھرے ہوئے لوگ
ہو جاتے ہیں بے چین
وہ جلا دیتے ہیں
ایک ٹوٹی لالٹین
ٹانگ دیتے ہیں کسی اونچے بانس پر
تاکہ ان کے ہونے کی خبر
پانی کے پار تک پہنچتی رہے
پھر اس مدھم روشنی میں
پانی کی آنکھوں میں
آنکھیں ڈالے ہوئے
وہ رات بھر کھڑے رہتے ہیں
پانی کے سامنے
پانی کی طرف
پانی کے خلاف
صرف ان کے اندر
اَرار کی طرح
ہر بار کچھ ٹوٹتا ہے
ہر بار پانی میں کچھ گرتا ہے
چھپاک چھپاک

○

(2)

ندیاں

وہ ہمیں جانتی ہیں
جیسے جانتی ہیں وہ اپنی مچھلیوں کی بے چینی
اپنے تٹوں کا درجہ حرارت
جو کہ ہمیں ہیں
بس ہمیں بھول گئے ہیں
ہمارے گھر کبھی ان کا بھی
آنا جانا تھا
ان کی نسوں میں بہتا ہے
پہاڑوں کا خون
جس میں تھوڑا سا خون
ہمارا بھی شامل ہے
اور گرم گرم دودھ
ٹپکتا ہوا بھورے درختوں کی چھال سے
پتہ لگا لو
درختوں کی چھال
اور ہماری توچہ کا گوتر
ایک ہی ہے
پرچھائیاں بھی اصل میں
ندیاں ہی ہیں
ہمیں سے پھوٹ کر
ہماری بنگال میں چپ چاپ بہتی ہوئی ندیاں
ہر آدمی اپنی پرچھائی میں

نہارتا ہے
اور لگتا ہے
ندی میں نہا رہا ہے
جو لگتا ہے وہ بھی
اتنا ہی سچ ہے
جتنا کوئی بھی ندی
پل
زمین کے سارے کے سارے پل
ایک گہری سازش ہیں
ندیوں کے خلاف
اور ندیاں انہی انہیں اس طرح برداشت کرتی ہیں
جیسے قیدی زنجیروں کو
حالانکہ ندیاں اسی لیے ندیاں ہیں
کہ وہ جب بھی چاہتی ہیں
الٹ پلٹ دیتی ہیں سارا کلنڈر
اور دِشاؤں کے نام
ہمارے دیش میں ندیاں
جب کچھ نہیں کرتیں
تب وہ لاشوں کا انتظار کرتی ہیں
اندھیرے کو چیرتے ہوئے
آتی ہیں لاشیں
وہ آتی ہیں اپنی خاموشیوں کی چوٹ سے
جینے کی دھار کو
تیز تر کرتے ہوئے
ندیاں انہیں دیکھتی ہیں

اور جیسے چلی جاتی ہیں کہیں اپنے ہی اندر
کن ہی جل مگن شہروں کی
خوشبو کی تلاش میں
ندیاں جو کہ اصل میں
شہروں کا آغاز ہیں
اور شہر جو کہ اصل میں
ندیوں کا خاتمہ
مجھے یاد نہیں
میں نے جغرافیہ کی کس کتاب میں پڑھا تھا
خاتمہ اور آغاز
اپنے اختلاف کی ساری گرماہٹ کے ساتھ
جس جگہ ملتے ہیں
کہیں وہیں سے نکلتی ہیں
ساری کی ساری ندیاں

○

(3)

چپ رہنے سے کوئی فائدہ نہیں

چپ رہنے سے کوئی فائدہ نہیں
میں نے دوستوں سے کہا اور دوڑا
سیدھے کھیتوں کی طرف
کہ لفظ کہیں پک نہ گئے ہوں
یہ دوپہر کا وقت تھا
اور لفظ پودوں کی جڑوں میں سو رہے تھے

خوشبو یہیں سے آ رہی تھی میں نے کہا
یہیں یہیں لفظ یہیں ہو سکتا ہے
جڑوں میں
پکتے ہوئے دانے کے اندر
لفظ کے ہونے کی پوری امید تھی
مجھے لگا مجھے ایک دانے کے اندر
گھس جانا چاہیے
پسنے سے پہلے مجھے پہنچ جانا چاہیے
آٹے کے شروع میں
چکی کی آواز کے پتھر کے نیچے
مجھے ہونا چاہیے اس وقت
جہاں سے
گانے کی آواز آ رہی تھی
یہ ماں کی آواز ہے میں نے کہا
چکی کے اندر ماں تھی
پتھروں کی رگڑ اور آٹے کی خوشبو سے
دھیرے دھیرے چھن رہی تھی
ماں کی آواز
پھر میں سو گیا
کب اور کہاں مجھے یاد نہیں
صرف چکی چلتی رہی
اور ماں کی آواز آتی رہی
رات بھر

○

(4)

بوجھے

فصل کٹ چکی
بوجھے باندھے جا رہے ہیں
ایک ضدی چیل
ہوا میں منڈلا رہی ہے
ہوا میں تیر رہی ہیں بہت سی
اداس آنکھیں
اور اب بھلا میں یہ کیسے بتاؤں
کہ جب بوجھے باندھے جا رہے ہیں
تین چار میمنیں
اپنی ساری خوبصورتی کے ساتھ
چرنے میں مشغول ہیں
کچھ ہاتھ ہیں
جو جھول رہے ہیں بغل میں
کچھ ہاتھ ہیں جو تابڑ توڑ
باندھ رہے ہیں بوجھے
جیسے بوجھے چرائے گئے ہوں
سورج کی ٹال سے
میمنے چر رہے ہیں
اور وہ باندھ رہے ہیں بوجھے
پر میں

میں یہاں کیوں ہوں
کیوں میں دیکھ رہا ہوں
ایک ہلکی سی تکلیف
اور ایک دھندلی سی امید کے ساتھ
بار بار بوجھوں کا
کھلنا اور بندھنا
اور لو
اب بندھ چکے بوجھے
بندھ چکا بہت کچھ
جو خوشبو اور ہنسی کی طرح
پھیلا ہوا تھا
کچھ لوگ اب جا رہے ہیں
اپنے بوجھے اٹھا کر
کچھ اور بھی ہیں
جو اب بھی کھڑے ہیں
اپنے بوجھے کے انتظار میں
میں انہیں دیکھتا ہوں
اور ہو جاتا ہوں پریشان
کیونکہ بوجھے اب دھیرے دھیرے
کم ہوتے جا رہے ہیں
سوچتا ہوں
جب سارے بوجھے اٹھ جائیں گے
جب کسی کے پاس
ڈھونے کے لیے نہیں کچھ ہوگا
سوا اپنے سر کے

تو کتنی خالی خالی
لگے گی دنیا
کتنے سُونے سُونے
دکھیں گے سر

○

(5)

پانی ایک روشنی ہے

انتظار مت کرو
جو کہنا ہو کہہ ڈالو
کیونکہ ہو سکتا ہے پھر کہنے کا
کوئی معنی نہ رہ جائے
سوچو
جہاں کھڑے ہو، وہیں سے سوچو
چاہے راکھ سے ہی شروع کرو
مگر سوچو
اس جگہ کی تلاش بیکار ہے
جہاں پہنچ کر یہ دنیا
ایک پوستے کے پھول میں بدل جاتی ہے
ندی سو رہی ہے
اسے سونے دو
اس کے سونے سے
دنیا کے ہونے کا انداز ملتا ہے
پوچھو

چاہے جتنی بار پوچھنا پڑے
چاہے پوچھنے میں جتنی تکلیف ہو
مگر پوچھو
پوچھو کہ گاڑی ابھی کتنی لیٹ ہے
اندھیرا بج رہا ہے
اپنی نظم کی کتاب رکھ دو ایک طرف
اور سنو سنو
اندھیرے میں چل رہے ہیں
لاکھوں کروڑوں پیر
پانی ایک روشنی ہے
اندھیرے میں یہی ایک بات ہے
جو تم پورے یقین کے ساتھ
دوسرے سے کہہ سکتے ہو

○

(6)

زمین رہے گی

مجھے یقین ہے
یہ زمین رہے گی
اگر اور کہیں نہیں تو میری ہڈیوں میں
یہ رہے گی جیسے پیڑ کے تنے میں
رہتی ہیں دیمکیں
جیسے دانے میں رہ لیتا ہے گھن
یہ رہے گی ختم ہونے کے بعد بھی میرے اندر
اگر اور کہیں نہیں تو میری زبان

اور میری نسوں میں
یہ رہے گی
اور ایک صبح میں اٹھوں گا
میں اٹھوں گا زمین سمیت
پانی اور کچھ سمیت میں اٹھوں گا
میں اٹھوں گا اور چل دوں گا اس سے ملنے
جس سے وعدہ ہے
کے ملوں گا

○

(7)

برلن کی ٹوٹی دیوار کو دیکھ کر

تین دن ہوئے
میں نے برلن میں دیکھے نہیں کوے
لیکن کیوں کوے؟
اس ہندوستانی شاعر کو کیوں چاہیے کوے
اس خوبصورت شہر میں
جبکہ آسمان اتنا ہی نیلا ہے
بغیر کووں کے بھی
یہ ایک چھوٹا سا ہوٹل ہے
جہاں ہم کچھ ہند پاک قلمکار
ٹھہرے ہیں ساتھ ساتھ
اور ہمارے پاسپورٹ چاہے جو کہتے ہوں
یہاں ہم میں سے ہر ایک تھوڑا تھوڑا ہند ہے تھوڑا تھوڑا پاک

ہم ساتھ ساتھ کھاتے ہیں
پیتے ہیں ساتھ ساتھ
ہنستے ہنستے کبھی کبھی ہو جاتے ہیں اداس بھی
یہ ساتھ ساتھ ہنسنا
اداس ہونا ساتھ ساتھ
ایک نایاب تجربہ ہے
ایک غیر ملکی زمین پر
وہاں باہر
میری کھڑکی سے دکھتے ہیں
دو ہوائی جہاز جیسے دو کبوتر
دو جنگ عظیم وہاں بنچ پر بیٹھے
بزرگوں کی یاد میں ٹھائیں ٹھائیں کرتے ہوئے
ایک تازہ مقناطیس انہی ہونٹوں سے گر کر
وہاں گھاس پر پڑا ہوا
پر میری کھڑکی سے دکھتی ہے
برلن کی ٹوٹی دیوار بھی
اور دیکھتا ہوں کہ اس کے چاروں اور
لگا رہی ہے چکر ایک پاگل عورت
نہ جانے کب سے
کہیں کچھ ہے کیل کی طرح
اس کی روح میں ٹھوکا ہوا
کہ رکنے ہی دیتا نہیں اسے
اور وہ بار بار
آ رہی ہے
جا رہی ہے

ادھر سے ادھر
اور ادھر سے ادھر
ادھر ایک چھوٹی سی محفل میں
سن رہے ہیں ہم احمد فراز کو
کوئی تازہ غزل سنا رہے ہیں وہ
جھوم رہے ہیں سب
جھوم رہا ہوں میں بھی
پر میری آنکھیں کھڑکی کے پار
برلن کی اس ٹوٹی دیوار پر ٹکی ہیں
جہاں وہ پاگل عورت غزل کو چیرتی ہوئی
لگائے جا رہی ہے اب بھی چکر پر چکر
جیسے کوئی بجلی کوند جائے
ایک دبی ہوئی یاد
جھک جھوڑ جاتی ہے مجھے
اور مجھے لگتا ہے کہیں میرے اندر بھی ہے
ایک پاگل عورت
جو دروازوں کو پیٹتی
اور دیواروں کو کھرچتی ہوئی
اسی طرح لگا رہی ہے چکر
میرے براعظم کے وسیع نقشے میں
نہ جانے کب سے
دیکھتا ہوں کہ غزل کے بیچ میں
کوئی مصرع بھول رہے ہیں احمد فراز
پچھلے شعر اور اگلے کے بیچ کا
ایک عجب سا سناٹا

بھر گیا ہے کمرے میں
پر مجھے لگتا ہے میرے بھیتر کی وہ پاگل عورت
اب ایک دیوار کے آگے کھڑی ہے
اور چیخ رہی ہے یہ دیوار
آخر یہ دیوار کب ٹوٹے گی؟
اتنے برس ہوئے
غزلوں سے بھرے اس براعظم میں
مجھے ایک بھولے ہوئے مصرع کا اب بھی انتظار ہے

○

(ہندی سے ترجمہ سرور الہدیٰ)

نیل منی پھوکن

یہاں سے دکھائی پڑتا ہے

یہاں سے پھیلتا ہے پانی افق سے آگے تک
جب تم پھیلاتی ہو ہاتھ
کیلے کا پتہ کانپتا ہے
جب پھیلا دیتی ہو بال
اتراتی ہے بارش
میرے دل میں ایک دانہ انکھواتا ہے
جو کھاتے وقت بے احتیاطی سے گر گیا تھا
لوگوں کے ہاتھ سے
ایک کبوتر آتا ہے
اپنی چونچ میں دبائے ہوئے گھاس کی ایک پتی
یا ہار ایک چمبیلی کا
کوئی نہیں مر رہا ہے کہیں بھی

نہ بچہ
نہ بوڑھا
یہاں سے دکھائی پڑتا ہے
ڈھلتا ہوا سورج
اور چڑھتا ہوا چاند
دکھائی پڑتی ہے دروازے سے
زمینی محبت سے پیدا شدہ
اور لگاتار گھومتی ہوئی

دو جوان عورتیں
دہ پرورتی کے دروازے پر کھڑی
استقبال کی حالت میں
تمہارے پیروں کے پاس سے
شروع ہوتا ہے پانی
اور پھیلتا جاتا ہے
افق کے پار تک

(آسامی سے ہندی ترجمہ: کیدار ناتھ سنگھ، ہندی سے ترجمہ: سرور الہدیٰ)

○

ایک نیلے رنگ کی کامیابی

ایک وسیع چٹانی علاقے میں دبا ہوا ہے
سب کو مل آواز میں گیت گانے والا وہ آدمی
ہرے بھرے کھیتوں کے درمیان سے اپنے ہاتھوں کو لہراتا ہوا وہ
اب ہمارے سر کے اوپر سایہ بننے نہیں آئے گا
راج ہنس بن کر پانی میں کھیلتی ہوئی پریوں سے چھین کر
اب وہ جیسی عمر ہمارے لیے نہیں لائے گا
گلے میں پھندے ڈال کر جھولتی ہوئی عورت کی طرح ہے
اب اس کی آواز کی حیرت ناکی میں
ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ٹوٹ جاتا ہے
ایک بڑا سیاہ آئینہ
ہم سبھی کے جذبات کی روحوں پر لوگوں سے بھرپور قصبوں اور شہروں تک بہتی ہوا کے جھونکے پر
سب سے نازک آواز میں گیت گانے والا وہ آدمی

صبح سویرے کے خوابوں کی طرح اس کی آواز
اس کے گیتوں کے ہر چاند اور سورج
سرخ پھلوں والی جھاڑیوں کا ہر پودا
اب ہمارے وجود کی اندھیری کوٹھڑی میں
ایک نیلی بازیافت ہے
پتھر اور جھرنوں سے بھری اس پربت میں
پتھر اور جھرنوں سے بھری پربت میں جب بارش ہوتی ہے
وہ لوگ مجھے اکیلا چھوڑ جاتے ہیں آڑی ترچھی برستی بوندیں مجھے اندر سے ڈھانے لگتی ہیں
آدھی رات کی ہوائیں ان لوگوں کی آنکھوں میں کھول دیتے ہیں
باندھ ٹوٹ کر بہ جانے والے کھیتوں کے پانی
رات موسلا دھار بارش کے بیچ کسی کی دکھ بھری چیخ سنتا ہوں
پتھروں کے دباؤ سے نکلنا مشکل ہے
کوئی چیخ رہا ہے
پتھر اور جھرنوں سے بھری اس پربت میں جب بارش ہوتی ہے کھیتوں کو ہرا
بھرا کرنے والے پانی جمع کرنے والا برتن اندھیرے میں دکھنے لگتا ہے
گلے تک ڈوبی ہوئی کملہ کنواری کا چہرہ
ایک نیلے رنگ کی کامیابی

(آسامی سے ہندی ترجمہ: پاپوری گوسوامی، ہندی سے ترجمہ: سرور الہدیٰ)

○

پتھر اور جھرنوں سے بھری اس پربت میں

پتھر اور جھرنوں سے بھری پربت میں جب بارش ہوتی ہے
وہ لوگ مجھے اکیلا چھوڑ جاتے ہیں آڑی ترچھی برستی بوندیں مجھے اندر سے ڈھانے لگتی ہیں
آدھی رات کی ہوائیں ان لوگوں کی آنکھوں میں کھول دیتے ہیں
باندھ ٹوٹ کر بہہ جانے والے کھیتوں کے پانی

رات موسلا دھار بارش کے بیچ کسی کی دکھ بھری چیخ سنتا ہوں
پتھروں کے دباؤ سے نکلنا مشکل ہے
کوئی چیخ رہا ہے
پتھر اور جھرنوں سے بھری اس پربت میں جب بارش ہوتی ہے کھیتوں کو ہرا بھرا کرنے والے پانی
جمع کرنے والا برتن اندھیرے میں دکھنے لگتا ہے
گلے تک ڈوبی ہوئی کملہ کنواری کا چہرہ

(آسامی سے ہندی ترجمہ: پاپوری گوسوامی، ہندی سے ترجمہ: سرور الہدیٰ)

○

وہ جمعہ تھا یا اتوار

وہ جمعہ تھا یا اتوار
ہواؤں نے چھین لیا تھا
منھ کے سامنے سے سنترا
سینے کے اندر محسوس کر رہا تھا میں
جیسے کلیجے پر دھکا دیتی ہوئی
رک گئی تھی
لٹک رہا تھا
اس شام جل کر راکھ ہوتی ہوئی آتم گلانی
وہ جمعہ تھا یا اتوار
آئینوں میں گونج رہی تھی
ٹوٹے ہوئے تاروں کی چیخیں

(آسامی سے ہندی ترجمہ: پاپوری گوسوامی، ہندی سے ترجمہ: سرور الہدیٰ)

○

بچے کی موت

ہمارے پہلے بچے کی
موت کے دن
ہم دونوں
آنسو بہاتے ہوئے
سوچ رہے تھے
دھرتی کے
تمام لوگوں کو
ملا کر ایک ہی جگہ
اگر ہم
ساتھ ساتھ رہ پاتے

(آسامی سے ہندی ترجمہ: دنکر کمار، ہندی سے ترجمہ: سرور الہدیٰ)

○

پہچان

نابینہ بزرگ نے
دوپہر کے آسمان میں
ایک نیلی چڑیا کو اڑا کر
بھرائی ہوئی آواز میں
ہم سے کہا تھا
لوگوں سے کہنا
ان کی دنیا میں

کوئی کسی کو کبھی
پہچان نہیں پایا

(آسامی سے ہندی ترجمہ: دنکر کمار، ہندی سے ترجمہ: سرور الہدیٰ)

○

ہر بات کا ایک نہ ایک مطلب ہوتا ہے

ہر بات کا ایک نہ ایک مطلب ہوتا ہے
جیسے پیار کا شاعری کا ہوا میں پانی کی آواز کا
اندھیرے میں کوئل کے بھوکنے کا
خون لگے کرتے کی جیب میں
چھپچھاتے کسی ٹڈے کا
مطلب نکالو تو ہر بات کا کوئی مطلب ہوتا ہے
مطلب کرنے والے کی 10 انگلیوں کے چھور پر
پنچ تروں میں بھی ایک ایک مطلب ہوتا ہے
جیسے چھوٹے بچے کھیلتے ہیں
کاٹا کوٹی کا کھیل
مطلب کا کھیل بھی چلتا رہتا ہے
اسی طرح گھائل لفظ بھی ڈھونڈتے ہیں
خون جسم کا ایک حلق
چلتا رہتا ہے عاشق اور شاعر کا پاگل پن
ہر شام پیڑوں کے سسکتے پتے ڈھونڈتے ہیں
ایک زبان کا نمکین ذائقہ
جلتا رہتا ہے
ایک بے نام بوڑھی عورت کی ہتھیلیوں میں جلتا ایک دیا

اے مہربان قاری
اور ایک مطلب کہو
جو شکار کو اس نے نہیں بتایا
(آسامی سے ہندی ترجمہ: شیو کمار توآری، ہندی سے ترجمہ: سرور الہدیٰ)

○

(9)

نیند میں بھی وہ مجھے دھکیلتا تھا

نیند میں بھی وہ مجھے دھکیلتا تھا
وہ بھلا کہاں ہے اب
اس کے چہرے پر اب بھی ہے کیا
اکھڑا ہوا پیڑ ایک
ہونٹوں پر بہتی ہے کیا
لال ہوئے جل کی ندیاں دو
دمکتے ہیں کیا اس کی آنکھوں میں
وہ کالے گھوڑے دو
آج بھی ہر رات میرا
کلیجہ روندتا ہے
(آسامی سے ہندی ترجمہ: کیدار ناتھ سنگھ، ہندی سے ترجمہ: سرور الہدیٰ)

○

جوشش عظیم آبادی

(1)

رخ یہ چاہے تھا کہ دل کو کرے تسخیر بہ زور
زلف نے ڈال ہی دی پاؤں میں زنجیر بہ زور

نطق کرتی ہے ترے سامنے طوطی اس طرح
جس طرح صاحبِ لکنت کرے تقریر بہ زور

یہ طلب گارِ جفا اس سے خفا تھا لیکن
لگ گئی آج گلے سے تری شمشیر بہ زور

توڑنا پھر بھی ہے منظور جو یہ دل شکناں
خانۂ دل کو مرے کرتے ہیں تعمیر بہ زور

دیکھتا کیا ہے کھڑا کھینچ کمر سے تلوار
لائی ہے سامنے تیرے مجھے تقدیر بہ زور

بے کسی پھر نہ کبھی آئیو آڑے ہرگز
کی معاف آج تو ان نے تری تقصیر بہ زور

ملک دل جس کا ٹک آباد نظر آتا ہے
لوٹ لیتا ہے، ترا حسنِ جہاں گیر بہ زور

اس کی نظروں پہ چڑھے صید دلوں کا کس طرح
جو کوئی صید حرم کو کرے نخچیر بہ زور

اس کے دل میں تو اثر کچھ نہیں کرتی جوشش
آہ کو اپنی کہیں صاحب تاثیر بہ زور

(2)

صد آفریں ہے یار تغافل شعار پر
بھیجا نہ شمع و گل بھی ہمارے مزار پر

تیرے ہی ڈر سے کچھ نہیں کہتا رقیب کو
ورنہ میں ایک بھاری ہوں پیارے ہزار پر

آتی ہے خوش مگر تجھے ظالم صدائے آہ
چھڑکے ہے تو نمک جو دلِ داغدار پر

پرخوں بہ رنگ ساغرِ لالہ ہے اِن دنوں
داغ جگر ہمارا ہے کیا ہی بہار پر

کیا ہے عجب جو اس رخ حیرت فزا کو دیکھ
تھم جائے اشک اس مژۂ اشک بار پر

محظوظ کوئے یار میں رہتی ہے ہر سحر
کرتی ہے کب صبا کرم اس خاکسار پر

جوشش نہ آتی ہاتھ کبھی تادم وفات
دل اپنا لوٹتا ہی رہا زلف یار پر

(3)

کیوں حیا سے تو نکلتا نہیں گھر سے باہر
دید خورشید ہے مقدور بصر سے باہر

نقش دل جب سے ہوا نام ترا مثل نگیں
گھر میں رہتا ہوں ولیکن میں ہوں گھر سے باہر

سیکڑوں تیر ترازو ہیں ترے غمزے کے
ایک دو ہوں تو نکالوں میں جگر سے باہر

اشکِ چشم آگے ترے خشک ہوا جاتا ہے
ہاں یہ لڑکا ہے نکلتا نہیں ڈر سے باہر

آہ بے تابیِ دل سوز جگر کے ہاتھوں
قطرۂ اشک نکلتے ہیں شرر سے باہر

ہر طرف تیرا ہی جلوہ ہے قفس میں صیاد
سخت حیران ہوں میں نکلوں کدھر سے باہر

انجمنِ عشق کا مت قصد کر اے طاہرِ دل
شعلے نکلے ہیں وہاں شاخِ شجر سے باہر

عیب جو اہل ہنر ہوے یہ امکان نہیں
عیب جوئی تو ہے آئین ہنر سے باہر

گننے میں آئیں جو دو چار ہوں لالے کی طرح
داغ اس دل میں تو ہیں مدِ نظر سے باہر

کیوں نہ آنکھوں میں جگہ اس کی ہو جوں مردم چشم
پاؤں بھی جس نے رکھا ہوئے نہ گھر سے باہر

مل گئے خاک میں یاں قافلے لاکھوں جوشش
چل سکے ہے کوئی اس راہ گزر سے باہر

○

(4)

مجھ پر بتاں کرم نہ کریں یا کرم کریں
یہ جور یہ جفا یہ تعدّی نہ کم کریں

وہ سنگ دل کبھی نہیں ہونے کا مہرباں
کیا فائدہ جو نالۂ و فریاد ہم کریں

دیکھا ہے جب سے ان کے دہاں و کمر کے تئیں
جی یہ ہی چاہتا ہے کہ سیر عدم کریں

وسعت کہاں ہے صفحۂ ہستی میں اس قدر
جو داستانِ عشق کو اس پر رقم کریں

جوشش ہمارے کلیسۂ احزاں میں خوب رو
ایسے کہاں نصیب کہ آئیں کرم کریں

○

(5)

جس کی محفل میں فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں
ہم کھڑے شمع صفت تا بہ سحر جلتے ہیں

کیا عجب گر شرر عشق دلوں کو دے آگ
ایک چنگاری سے تو لاکھوں ہی گھر جلتے ہیں

جب سے خوبان جہاں میں کیا میں تجھ کو پسند
دیکھ کر مجھ کس سبھی اہل نظر جلتے ہیں

یاد میں اس کی اٹھی جب سے کہ دل کی جرأت
آتش عشق میں بے خوف و خطر جلتے ہیں

کچھ علاج اس کا بھی آتا ہے طبیبو تم کو
رات دن سینے میں دل اور جگر جلتے ہیں

اشکِ حسرت کی یہ دولت تری دوری میں ہم
پانی میں ڈوبے ہی رہتے ہیں مگر جلتے ہیں

عاشق سوختہ جاں آتش دوری میں تری
یار لینی ہے تو لے جلد خبر جلتے ہیں

جو کوئی اس سے یہ کہتا ہے تو سن کر بے رحم
بول اٹھتا ہے کہ جلنے دے اگر جلتے ہیں

آگ پانی سے کبھی لگتے نہ دیکھی جوشش
آہ کیوں اشک سے یہ دیدۂ تر جلتے ہیں

○

رند لکھنوی

(1)

فصل گل میں کب اٹھا مجھ سے ستم صیاد کا
توڑ ڈالوں گا اگر ہوگا قفس فولاد کا

نو گرفتاری میں چندے یاد گلشن کی رہی
اب قفس سے چھٹ کے یاد آئے گا گھر صیاد کا

ضبط کرتے کرتے مرغان قفس تنگ آئے ہیں
اب رہائی ان کی ہو یا حکم ہو فریاد کا

سب سے بیگانہ ہوائے دل آشنائی اس سے کر
بھول جا سب کو ارادہ ہو جو اس کی یاد کا

رند شکوہ کیجئے کس سے بقول استاد کے
آب و دانہ نے دکھایا مجھ کو گھر صیاد کا

(2)

طور اغماض کا انداز ادا کا دیکھا
کیا کہوں تم سے کہ ان آنکھوں سے کیا کیا دیکھا

سیکڑوں مر گئے برباد ہے اک خلق خدا
جشن بھی قہر الٰہی کا نمونہ دیکھا

اپنے خوش چشم کی وحشت مجھے آیا دآتی ہے
کوئی رَم خواہ اگر آہوئے صحرا دیکھا

بہرہ فی نعمتِ دافی سے نہ ہوں اہلِ کرم
خشک پیاسوں کی طرح سے لب دریا دیکھا

پھر گیا سارا جہاں جب سے تو آزردہ ہوا
تیرا غصّہ بھی صنم قہر خدا کا دیکھا

آ گئی یاد ترے پھول سے رخساروں کی
باغ میں جاکے جو کوئی گل رعنا دیکھا

کبھی بالوں کو سنوارا کبھی ماتھا پونچھا
آئینہ لے کے سحر نے جو چہرہ دیکھا

ہوں وہ کافر کہ مسلمانوں نے اکثر مجھ کو
پھونکتے کعبے میں ناقوسِ کلیسا دیکھا

یوں تو جایا کیے ہر سال مہینوں لیکن
اب کی نوچندی میں اک چاند سا مکھڑا دیکھا

آ گئیں یاد غزل خوانیاں اپنی اے رند
کسی بلبل کو اگر زمزمہ پیرا دیکھا

(3)

تسلی روز تو کس کس کو جانِ جاں دے گا یہی ہے حسن تو جان اپنی اک جہاں دے گا
طلب کریں گے بھلا روزِ حشر کیا مجھ سے جو لٹ کے آئے گا وہ خاک ارمغاں دے گا
بیاں نہ کیجو قاصد تو میرا حال تباہ ہزار طرح کے فقرے وہ بدگماں دے گا
ملے گی روزِ جزا، بے طلب جزائے عمل کریم دے گا اُسے واں جو کوئی یاں دے گا

جو چند شعر کہے ہیں سنا دو پڑھ کر رند
تمہیں بھی دادِ سخن کوئی نکتہ داں دے گا

(4)

سنا ہے نام فقط پر نشاں نہیں معلوم پتا میں کیا دوں، مجھے خود مکاں نہیں معلوم
مثالِ گرد پسِ قافلہ ہوں سرگرداں گیا کدھر کو مرا کارواں نہیں معلوم
ہمیشہ ایک سا عالم ہے باغ ہستی پر کچھ اس چمن کی بہار و خزاں نہیں معلوم
تری جناب سے اے دوست ہے جہاں آگاہ وہ کون ہے جسے یہ آستاں نہیں معلوم
برنگ نکہت گل ہم ہیں خانہ زاد چمن قدامت اپنی، مجھے باغباں نہیں معلوم
نہ کر مذمتِ رنداں خموش رہ واعظ وہ کس کے حال پہ ہے مہرباں نہیں معلوم

رہیں گے کب تلک اے رند خواب غفلت میں
ہیں کس خیال میں اہل جہاں نہیں معلوم

(5)

ہم جو خاموش دم فکر سخن بیٹھے ہیں ڈھونڈھنے کو ترا مضمونِ دہن بیٹھے ہیں
ایک دن ہچکی بھی غربت میں نہ آئی افسوس مجھ کو بھولے ہوئے یارانِ وطن بیٹھے ہیں
بزمِ ماتم مری کیونکر نہ بنے رشک چمن میرے پھولوں میں کئی غنچہ دہن بیٹھے ہیں
نہ اٹھا کوچۂ دلدار سے دم لینے دے پھرتے پھرتے ابھی اے چرخِ کہن بیٹھے ہیں
للہ الحمد کہ غربت میں وہ راحت پائی دل سے بھولے ہوئے ہم یادِ وطن بیٹھے ہیں
زیرِ گردوں نہیں آرام کی صورت کوئی سب اٹھانے کو یہاں رنج و محن بیٹھے ہیں
دلِ شگفتہ ہو، ذرا بات کر اے غنچہ دہن ہم بڑی دیر سے مشتاق سخن بیٹھے ہیں

چند بیتیں جو لکھی ہیں وہ سُنا دے اے رند
آج محفل میں کئی اہلِ سخن بیٹھے ہیں

نیر مسعود

رہروِ تفتہ

(ڈراما)

الٹ رہی تھیں ہوائیں ورق ورق اس کا
لکھی گئی تھی جو مٹی پہ وہ کتاب تھا وہ

(زیب غوری)

قدرت کے تراشے ہوئے ایسے پیکر جن میں بیک وقت بے شمار صلاحیتیں یکجا ہو گئی ہوں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔ نیر مسعود انھیں کمیاب پیکروں میں سے ایک ہیں۔ انگریزی اصطلاح Perfectionist کا استعمال بجا طور پر نیر مسعود کے لیے کیا جا سکتا ہے۔

اپنی تحقیق کے دوران مجھے نیر مسعود کے ایک ڈراما کا کچھ سراغ ملا جس کا عنوان ''رہروِ تفتہ'' تھا۔ عنوان اس قدر پر کشش محسوس ہوا کہ تحریر دیکھنے کی خواہش ہوئی مگر کوشش کے باوجود بھی یہ ڈراما اس وقت دریافت نہ ہو سکا۔ بہر حال خدا نے صدق دل سے کی گئی کوشش کا صلہ کچھ اس طرح عطا کیا کہ جناب شعیب نظام صاحب کے توسل سے نیر مسعود کے رجسٹروں تک رسائی ممکن ہو گئی اور تمثال مسعود صاحب نے ان رجسٹروں کے عکس فراہم کر دیے۔ ان رجسٹروں کی فہرست سے معلوم ہوا کہ نیر مسعود کے متعدد مضامین ہنوز غیر مطبوعہ ہیں اور اگر شائع ہوئے ہیں تو میرے علم میں نہیں۔ تحقیق و تنقید کے اصول و نظریات پر مبنی یہ مضامین غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ انھیں تحریروں میں یہ ڈراما ''رہروِ تفتہ'' بھی شامل ہے۔ ڈرامے کی تدوین کے دوران بار بار یہ محسوس ہوا کہ نیر مسعود نے مکالموں مناظر اور وحدت تاثر کی ایک ایسی فضا قائم کی ہے جس سے باہر

آنا مشکل ہو جاتا ہے۔ نیر مسعود کا یہ ڈراما ''رہروِ تفتہ'' قارئین کے پیش نظر ہے۔

.....

(پس منظر میں مسلسل ہلکی المیہ موسیقی۔ دروازہ کھلنے کی دھیمی آواز)

باقر علی خاں: داروغہ کلّو، کیا ہے؟

کلّو: بیگم صاحب نے خیر خبر پوچھی ہے۔

باقر علی خاں: وہی حال ہے۔ کہو دعا کریں۔ خضر مرزا، جاؤ بیٹا تم دادی کے پاس رہو۔ انھیں لیتے جاؤ۔

داروغہ کلّو۔ روتے کیوں ہو تم تو ان کو اور پریشان کر دو گے۔

کلّو (روتے ہوئے): میاں چودہ برس کی عمر سے ان کی خدمت میں ہوں۔ نوکر ہوں لیکن مرزا صاحب نے بیٹوں کی طرح رکھا ہے۔ کیسی کیسی دلداری کرتے تھے۔ اب آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ رہے ہیں۔

باقر علی خاں: (ٹھنڈی سانس) ہاں بھائی سچ کہتے ہو (بلند تر آواز) تشریف لائیے ادھر نکل آئیے۔

دوست: اللہ اب کیا حال ہے؟

باقر علی خاں: بے ہوش ہیں۔ کچھ رہ نہیں گیا ہے۔

دوست: نہیں، کیوں کر یقین کروں۔ ابھی کل ہی تو خواجہ الطاف حسین ان کو دیکھ کر گئے ہیں۔ بتاتے تھے کہ اس وقت نواب علاؤالدین خاں کو خط لکھوا رہے تھے۔

باقر علی خاں: جی ہاں، اور خط میں یہ فقرہ بھی لکھوایا تھا کہ 'میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو ایک آدھ روز میں ہم سایوں سے پوچھنا'۔ اس وقت بھی کئی پہر کے بعد ہوش آیا تھا۔

دوست: ہائے ہائے! خواجہ سے یہی فقرہ سن کر تو مجھے خیال ہوا تھا کہ اب ماشاء اللہ رو بہ صحت ہیں۔ یہ تو گمان بھی نہ تھا کہ اس نوبت کو پہنچ گئے ہوں گے۔ بھلا جسے ایسے فقرے بولنے کا دماغ ہو.....

باقر علی خاں: دماغ نے ان کا ساتھ کب چھوڑا۔ کئی دن سے بے ہوشی طاری ہے لیکن ذرا دیر کو ہوشیار ہوتے ہیں تو پھر وہی مرزا اسد اللہ۔

(دروازے پر ہلکی سی دستک)

کون صاحب ہیں اندر تشریف لائیے۔

نو وارد: آداب بجالاتا ہوں.....(آواز دھیمی ہو جاتی ہے...) مرزا صاحب آرام فرما رہے ہیں؟ فیصلہ ہوا ہے کہ جو میرزا صاحب فرمائیں وہی سند.....اجازت ہو تو جب تک میرزا صاحب بیدار ہوں میں یہیں.....لیکن یہ میرزا صاحب.....یہ کیا حال ہے؟

باقر علی خاں: وقت آخر ہے۔کل سے ہوش نہیں آیا ہے۔

نو وارد: وقت آخر؟

باقر علی خاں: حکیم نے جواب دے دیا ہے۔اب تو جو دم ہے غنیمت ہے لیکن ہوش آنے کی امید نہیں۔

نو وارد: یہ کیا ہو گیا! اجازت ہو تو ذرا قریب سے چہرہ دیکھ لوں (وقفہ۔سانسوں کی آواز.....ہا ! کیا چراغ بجھ رہا ہے!

دوست: چہرے پہ کیسی مردنی چھا گئی ہے۔مگر بہ خدا دیکھیے۔اب بھی معلوم ہوتا ہے، کچھ سوچ رہے ہیں۔

باقر علی خاں: اور کیا خبر واقعی کچھ سوچ رہے ہوں۔

(المیہ موسیقی تیز ہو کر دوسرے آرکسٹرا میں ڈسالو)

(سمندر کی آواز کا تاثر)

آوازِ غالب: میں، اسد اللہ خاں غالب، سوچ نہیں رہا ہوں ڈوب رہا ہوں اور ڈوبنے والا سوچتا نہیں دیکھتا ہے۔میں بھی دیکھ رہا ہوں۔عالمِ آب وگل میں آنکھ کھولنے سے لے کر جادۂ راہِ فنا پر قدم رکھنے تک، سب ایک ساتھ دیکھ رہا ہوں۔سات پھول دیکھ رہا ہوں کہ ایک کے بعد ایک کھلے اور مرجھا گئے۔میں، کہ عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں۔اپنے پھولوں کو روتا نہیں دوسروں کے پھولوں سے جی بہلاتا ہوں۔مرزا جیون بیگ بھی ایک پھول ہے لیکن اسے میرے پاس آنے نہیں دیتے۔ٹھیک ہے بھائی مرتے ہوئے بڈھوں کے پاس بچوں کو نہ جانا چاہیے، لیکن میں مر نہیں رہا ڈوب رہا ہوں۔ڈوب رہا ہوں اس لیے دیکھ رہا ہوں۔دیکھ رہا ہوں اس لیے سن رہا ہوں۔

آرکسٹرا

آوازِ مغنی:

کس کا خیال آئینۂ انتظار تھا
ہر برگ گل کے پردے میں دل بے قرار تھا
اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو
توڑا ہے جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا
موج سراب دشت وفا کا نہ پوچھ حال
ہر زرہ مثل جوہر تیغ آب دار تھا
گلیوں میں میری ناش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سرِ رہ گزار تھا
کم جانتے تھے ہم بھی غم عشق کو پر اب
دیکھا تو کم ہوئے پہ غم روزگار تھا

☆☆

آوازِ غالب: ہاں صاحب، غم عشق کم ہوئے پرِ غم روزگار تھا، غم روزگار بڑھا تو غمِ عشق فراموش ہو گیا۔

غم زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی
وگرنہ کھینچتے تھے ہم بھی لذتِ الم آگے

دوسرا آرکسٹرا

غالب: لو صاحب !ہاتھ آگے بڑھائیے۔نواب میرزا اسد للہ بیگ خاں، کہ آپ کے کفیل ہیں۔شاعری میں شہرۂ ہندوستاں، سخاوت میں حاتمِ دوراں....

امراؤ بیگم: اچھا بس، باتیں نہ بنائیے۔لائیے دیکھوں...(وقفہ)....یہ کیا؟

غالب: زر ہے، بیگم صاحب، زر! وہی جو شاہد گل کو باغ سے بازار میں لاتا ہے۔میں اسے بازار سے گھر میں لایا ہوں، مگر نہ پوچھیے کیوں کر۔اب آپ اسے گھر سے بازار بھیجیے۔

امراؤ بیگم: بنیے کا ادھار چکانے کے بعد اس میں کیا بچے گا، آپ نے حساب بھی لگایا؟

غالب: الحمدللہ کہ حساب سے محض ناواقف ہوں۔دینا میرا کام، حساب کرنا آپ کا کام۔

امراؤ بیگم: یا اللہ، کیا میری قسمت...

غالب: نہیں نہیں۔ آپ اپنی زبان کو تکان نہ دیں۔ میں آموختہ دہراتا ہوں: یا اللہ کیا میری قسمت میں یوں ہی سسک سسک کے مرنا لکھا ہے۔ اس کے بعد روئے سخن مجھ رو سیاہ کی طرف۔ معلوم نہیں کن گناہوں کی سزا میں آپ کے پلے باندھ دی گئی۔ نہ دین کی رہی نہ دنیا کی۔ اچھے بھلے اکبر آباد میں رہتے تھے۔ بیٹھے بٹھائے جی میں سمائی اور دلی میں چلے آئے۔ اور مقطع عرض ہے: یا اللہ تو مجھے اٹھا کیوں نہیں لیتا۔

امراؤ بیگم: ٹھیک ہے اس طرح مسخرے پن سے سب کا پیٹ بھرتے رہیے۔

غالب: نیک بخت، اگر تیرا شوہر مسخرا پن چھوڑ دے تو کیسی رہے؟ جیتے جی.... کیوں یار چے؟ تم کیا دیکھ رہے ہو۔ جی نہیں، جی نہیں! گود میں آنے کی نہیں ہوتی۔ وہیں بیٹھ کر عالمِ حیرت کی سیر کیجیے۔

امراؤ بیگم: اے تو دم بھر کو لے لیجیے نا؟ کیسا ہمک رہا ہے!

غالب: جی نہیں ہمارا افراسیاب آپ ہی کی گود میں اچھا لگ رہا ہے۔ واہ! واہ! واہ! بالکل معلوم ہوتا ہے نواب اسد اللہ خاں غزل سنانے جا رہے ہیں۔ تم ہمارے یار چے کو دیکھنا، دوسرا غالب نکلے گا۔

امراؤ بیگم: نوج! میں ایک ہی سے بھر پائی۔ میں تو اسے آپ کا ایک شعر بھی نہ سننے دوں گی۔

غالب: کیوں نہیں سنے گا۔ سنے گا اور کہے گا۔ مکرر ارشاد۔ اور میں مکرر ارشاد کروں گا۔ کیوں یار چے؟

امراؤ بیگم: ضرور ضرور! یہ تو آپ کو پہچانے گا بھی نہیں۔ جب سے ہوا ہے ایک بار بھی تو گود میں نہیں لیا۔ آخر یہ کیا وحشت ہے؟

غالب: یوں ہی، سوچتا ہوں گود میں لوں گا تو اتارنے کو جی نہ چاہے گا۔ اے لو، وہ ہنسے۔

(المیہ ساز۔ امراؤ بیگم کی سسکیوں کی آواز)

آوازِ غالب: میں دیکھ رہا ہوں۔

(المیہ ساز ڈزالو۔ سمندر کی آواز تیز)

آوازِ غالب: بند آنکھوں سے میں وہ بھی دیکھ رہا ہوں جو میں نے نہیں دیکھا تھا۔ افراسیاب تورانی سے ترکانِ سلجوقی تک، ترکانِ سلجوقی سے عبداللہ بیگ خاں تک، سواروں کا ایک سلسلہ....

(گھوڑوں کی ٹاپوں اور تلواروں کی جھنکار کی آواز)

آوازِ غالب: یہ وہ شہسوار ہیں جو کبھی اپنے لیے تلوار چلاتے تھے اب اوروں کے لیے چلاتے ہیں۔ عبداللہ بیگ خاں راجا بختاور سنگھ کے لیے تلوار چلاتا ہے۔ میں اسے الور کی خاک پر لوٹتے

دیکھ رہا ہوں۔اس کا خون راج گڑھ کی مٹی میں مل رہا ہے اور اکبر آباد میں اس کی بیوہ تین بچوں کو سینے سے چمٹائے رو رہی ہے۔عبداللہ بیگ کا بھائی نصراللہ بیگ ان بچوں کے سر پر ہاتھ رکھتا ہے۔کوئی اسے روکو! (بلند آواز) نصراللہ بیگ! کیا کرتا ہے! وہ دیکھ، ان بچوں میں مرزا نوشہ بھی ہے۔یہ مربی کش محسن سوز تجھے بھی.....نصراللہ بیگ! نہیں سنتا؟

(ہاتھی کے گھنٹوں کی آواز)

آوازِ غالب:.....لو وہ ہاتھی پر سے گرا! لوگ دوڑ رہے ہیں، لیکن اب وہاں کیا رکھا ہے۔عبداللہ بیگ کی طرح نصراللہ بیگ بھی.....قصور اس کا یہ تھا کہ وہ میرزا نوشہ اسداللہ بیگ کا چچا تھا۔

آوازِ مغنی:

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

آوازِ غالب: خاک کیا خاک جواب دے گی۔گنج ہائے گراں مایہ کا جواب میرزا نوشہ سے پوچھا چاہیے۔لیکن وہ تو حساب سے محض ناواقف ہے۔اسے حساب کرنے کی فرصت بھی نہیں۔اس لیے کہ وہ طوفان طرب سے اٹھتی ہوئی چار موج میں ڈوب چکا ہے۔

(سارنگی کی آواز، طبلے کی تھاپ، گھنگھروؤں پر رقص کے توڑے، قلقل مینا)

آوازِ غالب: مگر وہ دود چراغ کا تریاکی بھی ہے۔اسے نشہ فکر سخن بھی رہتا ہے۔رات کو وہ دیوانِ بیدل کے اوراق میں ڈوبتا ہے، اور خود تختے کا بیدل بن کر ابھرتا ہے:

گدائے طاقت زباں تجھ سے
کہ خامشی کو ہے پیرایۂ بیاں تجھ سے
فسردگی میں ہے فریاد بے دلاں تجھ سے
چراغ صبح گل موسم خزا تجھ سے
بہار حیرت نظارہ سخت جانی ہے
حنائے پائے اجل خون کشتگاں تجھ سے
چمن چمن گل آئینہ در کنار ہوس
امید محو تماشائے گلستاں تجھ سے
پری بہ شیشہ و عکس رخ اندر آئینہ

نگاہ حیرت مشاطہ خوں فشاں تجھ سے
نیاز پردہ اظہار خود پرستی ہے
جبین سجدہ فشاں تجھ سے آستاں تجھ سے
اسد طلسم قفس میں رہے قیامت ہے
خرام تجھ سے، صبا تجھ سے، گلستاں تجھ سے

رقص وسرور کی آوازیں تیز ہوکر ڈسالو

آوازِ غالب: اور وہ نشے سے ذرا چونکتا ہے تو دیکھتا ہے زمانہ کہیں سے کہیں پہنچ گیا:

رفتار عمر قطع رہِ اضطراب ہے
اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے

(سمندر کی آواز تیز)

دوست: حضرت آداب بجالاتا ہوں۔ مجھے پہچانا؟

غالب: آؤ صاحب! جی یوں نہیں، گلے سے لگو..... ہاں، اب ذرا حساب لگا کر بتاؤ، کتنی مدت کے بعد ملے ہو؟

دوست: بس آپ کی شادی میں آخری بار ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے بعد میں بھی ادھر ادھر رہا۔

غالب: تو یوں کہو اگلے جنم کے ملاقاتی ہو بھائی، اس کے بعد سے تو میں کئی بار مر چکا ہوں۔ سنو، شادی کے بعد دلی میں آ رہا۔ پینشن کا روپیہ ساڑھے باسٹھ روپے ماہوار۔ کچھ الور سے لے مرتا تھا، کچھ والدہ مرحومہ دے گزرتی تھیں۔ شعر کہتا اور فسق و فجور میں مبتلا رہتا تھا۔ گاہے گاہے دل پر داغ پڑتا سو اسے شراب سے دھو دیتا تھا۔ لے بھائی ۱۸۲۵ میں مرزا یوسف جوان بھائی دیوانہ ہوگیا۔ دوسرے برس نواب احمد بخش خاں کہ میری پینشن کے ذمے دار تھے، لوہارو کی حکومت سے بیٹوں کے حق میں دست بردار ہوئے اور پینشن کی ادائی نواب شمس الدین خاں کے ہاتھ میں آئی۔

دوست: نواب شمس الدین احمد خاں تو آپ سے کچھ.....

غالب: کچھ نہیں، بہت کچھ۔ پینشن میرے حق میں بھیک سے بدتر ہوگئی۔ سرکار انگریزی میں داد

خواہی کو کلکتے پہنچا۔ عجب شہر دل پذیر ہے۔ مگر خیر دو سال وہاں تلف کیے اور نا مراد دلی واپس آیا۔ کوشش اپنی سی کیے جا رہا ہوں لیکن اب ڈوبی اسامی ہوں۔ ہاتھ خالی دیکھ کر قرض خواہ ہاتھ پھیلائے دوڑ پڑے۔ عجب خلقت ہے ان لوگوں کی بھی۔ جب یقین ہو گیا کہ میں کچھ دے نہیں سکتا تو مانگنے آتے ہیں۔ اوندھے پیالے میں شراب ڈھونڈھ رہے ہیں۔ اب حال یہ ہے کہ قرض کی ڈگری ہو چکی ہے ادائی پر قادر نہیں وارنٹ جاری ہے مگر چونکہ اشراف میں شمار ہوتا ہوں گھر سے گرفتار نہیں کیا جاؤں گا البتہ دروازے سے قدم نکالا کہ پکڑا گیا۔ یوں سمجھو کہ آشیانے کے قریب دام سخت پنہاں ہے۔

دوست: اس وقت مجھ کو آپ کا احوال معلوم کر کے نہایت قلق ہوا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ آپ خانہ قید ہیں۔

غالب: نہیں خانہ قید بھی نہیں۔ کبھی کبھی شام کو سوار ہو کر باہر نکل لیتا ہوں۔ چلو تو چلو، تمھیں بھی تھوڑی سیر کرا دوں۔

(دروازہ کھلنے کا دھڑاکا)

یا وحشت! آنا ہی سمجھ میں نہیں آتا مری گو آئے۔ خیر تو ہے کلّو؟

کلّو: غضب ہو گیا حضور کسی نے فریزر صاحب کو گولی مار دی۔

غالب؟ ولیم فریزر کو؟

دوست: رزیڈنٹ صاحب کو؟ نہیں بھائی!

کلّو: حضور، شہر کی ناکہ بندی ہو گئی ہے۔ لوگ نواب شمس الدین احمد خاں کا نام لے رہے ہیں۔

دوست: نواب شمس الدین احمد؟ ہاں جاگیر کے معاملے میں رزیڈنٹ صاحب نے نواب کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ یہ بات مشہور تو تھی کہ نواب رزیڈنٹ سے عداوت رکھتے ہیں۔ لیکن یہاں تک عداوت.... سمجھ میں نہیں آتا۔

غالب: نواب رزیڈنٹ سے عداوت رکھتے تھے، ہاں۔ لیکن ولیم فریزر کی موت کا سبب یہ ہے کہ غالب اس سے محبت رکھتا تھا۔

(آرکسٹرا۔ سمندر کی آواز)

آوازِ غالب: میں آپ اپنا تماشائی بن گیا ہوں۔ نواب شمس الدین احمد کے پھانسی پانے اور ان کی ریاست کی ضبطی کے بعد غالب کو سرکار انگریزی سے پینشن کی بھیک مانگتے دیکھتا ہوں۔ لفٹننٹ

گورنر سے لے کر حضور ملکہ معظمہ تک کے یہاں اس کو گڑ گڑاتے دیکھتا ہوں۔ دیکھتا ہوں کہ وہ گھر پر جُوا کھلا رہا ہے، پکڑا جاتا ہے، قید ہوتا ہے، چھوٹتا ہے۔ اب مفلس ہی نہیں، بے آبرو بھی ہے۔ لیکن تین برس کے اندر درباری تاریخ نویس مقرر ہو جاتا ہے۔ حضرت ظل سبحانی سے خلعت پاتا ہے، خطاب پاتا ہے۔ نجم الدولہ! دبیر الملک! نظام جنگ! تنخواہ پاتا ہے، خوش ہوتا ہے اور عارف سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ عارف کو مرنا ہی تھا اس لیے کہ غالب اسے اولاد کی طرح چاہتا تھا۔

آواز مغنّی:

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

(آرکسٹرا۔ سمندر کی آواز)

.....

(داد کی آوازیں جو غزل خوانی کے دوران جاری رہتی ہیں)

غالب:

نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ ہم ستم گر ہیں
مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہیے
وہ نیشتر سہی پر دل میں جب اتر جاوے
نگاہ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے
کہیں حقیقتِ جاں کاہیِ مرض لکھیے
کہیں مصیبت ناسازیِ دوا کہیے

کبھی شکایت رنج گراں نشیں کیجے
کبھی حکایت صبر گریز پا کہیے
رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجے
کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے
نہیں نگار کو الفت نہ ہو نگار تو ہے
روائ روش و مستی ادا کہیے
نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے
طراوت چمن و خوبیِ ہوا کہیے
سفینہ جب کہ کنارے سے آلگا غالب
خدا سے کیا ستم و جور ناخدا کہیے

☆☆

دوست ا: میرزا صاحب سمجھ میں نہیں آتا کس طرح تعریف کروں۔

غالب: تو صاحب پریشان کیوں ہوتے ہو، تعریف نہ کرو۔

دوست ا: واہ حضت، تعریف نہ کروں تو کافر ٹھہروں۔ بس، خاموشی از ثنائے تو حدِّ ثنائے تست۔

دوست ۲: میں تو مقطع میں گم ہو کر رہ گیا۔ سفینہ جب کہ کنارے سے آلگا، خدا سے کیا..... ہائے ہائے، کیا سچا نقشہ ہے آپ کی زندگی کا! کیا تو وہ پریشانی کے دن تھے کہ ہم آپ کا حال دیکھتے تھے اور کڑھتے تھے کہ ایسا صاحب کمال اور یوں آشفتہ حال پھرے.....

دوست ا: خیر، خدا نے وہ دن دور کیے۔ قلعے کی ملازمت، پھر حضرت ظل سبحانی کی استادی، شہزادوں کی استادی، دربار رام پور سے توسّل، حضرت واجد علی شاہ کی سرکار سے وظیفہ.....

غالب: ہاں، سچ پوچھو تو غالب علیہ الرحمہ ان دنوں مزے میں ہیں۔ کھانے کو آم پینے کو شراب، اترانے کو رسوخ کی کمی نہیں۔ شاعری بھی ذریعہ عزت بنی ہوئی ہے۔ ذریعۂ عزت ہی نہیں ذریعہ معاش بھی۔ اس پر کبھی کبھی اپنے تئیں نفریں بھی کرتا ہوں۔

دوست ا: نفریں؟ نفریں کیسی مرزا صاحب؟ میں تو کہتا ہوں آپ نے اپنی شاعری سے کچھ بھی نہیں پایا۔ آج آپ سا دوسرا شاعر کوئی ہے؟ ایسے کلاموں پر تو اگلے شاعر ہزاروں روپے سمیٹ لیتے تھے۔

دوست ا: ایک ایک قصیدے پر ہزاروں سمیٹ لیتے تھے۔ یہ کہیے اب وہ زمانہ نہیں رہا۔ ورنہ آپ کا وہ قصیدہ عرفی کی زمین میں.... ابھی ایک دن نواب ضیاء الدین خاں سنا رہے تھے..... وہ... کون سی زمین تھی

غالب: اچھا وہ رفتم والا۔ ہاں، وہ قصیدہ شاہ اودھ نصیر الدین حیدر مرحوم کی خدمت میں بھیجا تھا۔

دوست ا : بس تو حضور، عرفی کو جلال الدین اکبر ملا، آپ کی قسمت میں نصیر الدین حیدر.....

غالب: نہیں بھائی، یہ نہ کہو۔ نصیر الدین حیدر بھی بڑا حوصلے کا بادشاہ تھا۔ قصیدے کا قصہ سن لو اور عبرت کھینچو۔ یہ قصیدہ منشی محمد حسن کی معرفت وزیر اودھ روشن الدولہ کے پاس اور روشن الدولہ کے توسط سے نصیر الدین حیدر کے پاس گزرا۔ جس دن گزرا اسی دن پانچ ہزار روپے بھیجنے کا حکم ہوا۔

دوست ا: واللہ؟

غالب: سنے جاؤ۔ منشی محمد حسن نے مجھے اس کی کچھ اطلاع نہ دی۔ تو وہ کہیے مظفر الدولہ لکھنؤ سے دلی آئے، انھوں نے یہ راز مجھ پر ظاہر کیا اور کہا، خدا کے واسطے منشی محمد حسن کو میرا نام نہ لکھنا۔ ناچار میں نے امام بخش ناسخ کو لکھا کہ تم دریافت کر کے لکھو کہ میرے قصیدے پر کیا گزری۔ انھوں نے جواب لکھا کہ پانچ ہزار روپے ملے۔ تین ہزار روشن الدولہ نے کھائے، دو ہزار منشی محمد حسن کو دیے اور فرمایا کہ اس میں سے جو مناسب سمجھو غالب کو بھیج دو۔ کیا اس نے ہنوز تم کو کچھ نہ بھیجا؟ میں نے لکھ بھیجا کہ مجھے پانچ روپے بھی نہیں ملے۔ اس کے جواب میں انھوں نے لکھا کہ اب تم مجھے خط لکھو۔ اس کا مضمون یہ ہو کہ میں نے بادشاہ کی تعریف میں قصیدہ بھیجا ہے اور یہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ قصیدہ حضور میں گزرا، مگر یہ نہیں جانا کہ اس کا صلہ کیا مرحمت ہوا۔ میں کہ ناسخ ہوں، بادشاہ کو پڑھوا کر ان کا کھایا ہوا روپیہ ان کے حلق سے نکال کر تم کو بھیج دوں گا۔

دوست ۲: آہاہا۔۔۔ ناسخ تو ناسخ!

غالب: بھائی، یہ خط لکھ کر میں نے ڈاک میں روانہ کیا۔ آج خط روانہ ہوا تیسرے دن شہر میں خبر اڑی کہ نصیر الدین مر گیا۔ اب کہو، میں کیا کروں اور ناسخ کیا کرے؟

دوست ا: اللہ اللہ! اس تنگ دستی میں پانچ ہزار کی رقم کا آتے آتے ہاتھ سے نکل جانا...

غالب: خیر وہ دن بھی رفت گذشت ہوئے۔ اب ان کا ذکر کیا۔ اچھا صاحبو، اب میں روٹی کھانے جاتا ہوں۔ یار زندہ صحبت باقی۔

دونوں دوست: خدا حافظ، خدا حافظ۔

(وقفہ)

غالب: (بلند آواز میں) ارے بھائی، حضرت موسیٰ کی بہن کہاں ہیں؟ (قدر دھیمی آواز) اچھا یہیں تشریف رکھتی ہیں؟ لاؤ صاحب، کھانا دلواؤ۔ پھر لطف خاص فرماؤ، آم کھلواؤ۔ اچھی طرح بھیگ گئے ہیں نا؟

امراؤ بیگم: توبہ ہے، وظیفہ پڑھنا دوبھر کر دیا۔

غالب: اچھا اچھا، خدا سے راز و نیاز ہو رہے ہیں۔ کیوں نہ ہو، حضرت موسیٰ کی بہن جو ٹھہریں۔ اے بی کبھی تو اللہ کو چین سے بیٹھنے دیا کرو۔

امراؤ بیگم: گستاخی کے کلمے منہ سے نکالتے چلے جا رہے ہیں۔ خود تو کبھی توفیق نہیں ہوتی.....

غالب: توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے بڑی بی۔ ہم تو یوں کہتے ہیں:

سفینہ جب کہ کنارے سے آ لگا غالب
خدا سے کیا ستم و جور نا خدا کہیے

امراؤ بیگم: سبحان اللہ

غالب: کیا! یہ کون بولا؟

امراؤ بیگم: کہاں؟

غالب: ابھی کسی نے میرے شعر کی تعریف کی۔ آواز کچھ آپ کی سی معلوم ہوئی تھی۔

امراؤ بیگم: اچھا شعر ہوگا تو تعریف کیوں نہ ہوگی۔

غالب: کیوں صاحب، مجھے تو اس شعر میں کوئی سقم نظر نہیں آتا۔ پھر بھلا یہ آپ کو اچھا کیوں معلوم ہوا؟

امراؤ بیگم: سن کر مجھے خیال آ گیا کہ اللہ نے کن کن دکھوں کے بعد ناؤ کنارے لگائی ہے۔

غالب: (ٹھنڈی سانس) سفینہ جب کہ کنارے سے آ لگا..... لیکن کیا واقعی سفینہ کنارے سے.....

(آواز توپوں کے دھماکوں میں ڈوب جاتی ہے۔ غدر کا تاثر۔ گھوڑوں کی ٹاپیں اور ہنہناہٹ۔ تلواروں کی جھنکار۔ بندوق کے فائر۔ لوگوں کا شور)

آوازِ غالب:

ہے موج زن اک قلزمِ خوں کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا میرے آگے

(غدر کی آوازیں تیز تر ہو کر سمندر کی آواز میں ڈزالو)

آوازِ غالب: وہ سفینہ کہ کنارے سے آلگا تھا، ۱۸۵۷ء میں پھر قلزم خوں کی موجوں پر تھا۔ ناخدا کوئی نہ تھا جس کی خدا سے شکایت کرتا۔ قلعے کی تنخواہ گئی، سرکارِ انگریزی کی پینشن گئی، دربار اودھ کا وظیفہ گیا، وہ آگ بھڑکی سرد ہوئی اور غالب کو خاکستر کر گئی۔ اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو۔ لیکن کوئی یہ نہ سمجھے کہ اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں۔ انگریز کی قوم میں سے جو قتل ہوئے ان میں کوئی میرا امید گاہ تھا کوئی میرا شفیق، اور کوئی میرا دوست، اور کوئی میرا یار، اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز کچھ دوست، کچھ شاگرد، کچھ معشوق وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔

وہ فراق اور وہ وصال کہاں وہ شب و روز وہ ماہ و سال کہاں
فرصت کاروبار شوق کسے ذوق نظارہ جمال کہاں
دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا شور سودائے خط و خال کہاں
تھی وہ اک شخص کے تصور سے اب وہ رعنائی خیال کہاں
ہم سے جو چھوٹا کمار خانۂ عشق واں جو جائیں گے رہ میں مال کہاں
فکر دنیا میں سر کھپاتا ہوں میں کہاں اور یہ وبال کہاں
ایسا آساں تو نہیں لہو رونا دل میں طاقت جگر میں حال کہاں

(سمندر کی آواز)

آوازِ غالب: غالب ٹھوکریں کھا رہا ہے، غالب بہرا ہو رہا ہے، غالب اندھا ہو رہا ہے لیکن میں اسے نہیں دیکھ رہا ہوں۔ میرے سامنے وہ دشت خیال ہے جس میں اسد اللہ خاں ساری عمر سرگرداں رہا۔ یہ دشت خیال بھی ایک عالم ہے۔ زمین کے آئینے پر آفتاب کا عکس پڑ رہا ہے۔ کبھی موج رنگ کے طوفان میں شمعیں جلتی ہیں کبھی اڑتی ہوئی ریت میں آہو کی آنکھ چمکتی ہے۔ کبھی کوئی گریباں چاک ہوتا ہے اور سر کہسار تک جادہ بن جاتا ہے۔ کبھی فرش گل پر شاخ گل کا سایہ پڑتا ہے۔ یہ سب کیا ہے، یہ سب کیوں ہے، میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ میں صرف دیکھ رہا ہوں اور

ڈوب رہا ہوں مگر.....میں کچھ اور دیکھنا چاہتا ہوں۔ معلوم نہیں کیوں لیکن.....کاش کہ ڈوبنے سے پہلے صرف ایک بار کوئی.....کوئی ایک پھول....

(سمندر کی آواز تیز ہو کر ابتدا والی المیہ موسیقی میں ڈسالو)

باقر علی خاں: حکیم صاحب ذرا دیکھیے کیا ختم ہو گئے؟

حکیم محمود خاں: ختم ہی سمجھیے۔ معلوم نہیں کس چیز میں دم اٹکا ہوا ہے۔

باقر علی خاں: کون چیز ہو سکتی ہے۔ انھیں تو اب خواہش ہی نہیں رہ گئی تھی....

(دروازہ کھلنے کی دھیمی آواز)

ہاں، داروغہ کلّو؟

کلّو: بیگم صاحب نے کہلوایا ہے کہ بے ہوش ہونے سے پہلے انھوں نے کہا تھا مرزا جیون بیگ کو بلاؤ۔

حکیم محمود خاں: مرزا جیون بیگ؟

باقر علی خاں: میری بیٹی کو وہ پیار سے مرزا جیون بیگ کہتے تھے۔ ہاں، سچ ہے، داروغہ کلّو، جاؤ جندو بیگم کو لے آؤ۔

کلّو: یہ کیا آ گئی ہیں۔

باقر علی خاں: جندو بیگم، بیٹی آؤ، ادھر آؤ، رو نہیں۔

جندو بیگم: (روتے ہوئے) دادا ابا کیوں نہیں بولتے؟

حکیم محمود خاں: آؤ بیٹی، ذرا ان کو پکارو۔ وہ ضرور بولیں گے، اچھے ہو جائیں گے۔ ہاں، آؤ، شاباش۔

باقر علی خاں: کان میں پکارو بیٹی، شاباش۔

وقفہ

جندو بیگم: (تیز آواز) دادا ابا!

(سمندر کی ہلکی آواز)

جندو بیگم: (تیز تر آواز) دادا ابا!

(بازگشت کی طرح سمندر کی آواز بہت تیز ہو کر غائب)

کلّو: دیکھیے دیکھیے، وہ آنکھیں کھول رہے ہیں!

حکیم محمود خاں: انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ہا! اسد اللہ خاں تمام ہوا۔

باقر علی خاں: داروغہ کلّو، جاؤ، خبر کردو۔ (روکر) مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں....

(سمندر کی تیز آواز میں غالب کی مدھم آواز)

آوازِ غالب:

رہ روِ تفتہ در رفتہ بہ آبم غالب
توشہ بر لبِ جو ماندہ نشان است مرا

(صرف سمندر کی آواز)

ترتیب وتدوین۔ مہ جبیں خان

زوال پرستی پر ایک مذاکرہ

زوال پرستی کے سوال پر یہ گفتگو بہ زبان انگریزی شاید سب سے پہلے مئی/جون 1965 کے STREETS MAGAZINE میں شائع ہوئی تھی۔ جب سے اب تک، اس کرۂ خاکی کے دریاؤں کا بہت سارا پانی پُلوں کے نیچے سے گزر چکا ہے۔ دنیا بدلی، حالات بدلے، سیاسی، تہذیبی، مادّی تبدیلیوں کے جبرنے سوچ کے دھارے بدل دیے۔ لیکن اردو کے ترقی پسند اکّا دکّا تبدیلیوں کے باوجود، اب تک اسی دائرے میں مقیّد ہیں جس پر مارکس اور اینگلز نے بھی کبھی الطاف کی نظر نہیں ڈالی۔ ان حلقوں سے جب کبھی انحراف کی کوئی آواز اٹھی، اسے ترمیم پسند بھی نہیں بلکہ تحریف پسند کہہ کر پرانی رٹ کے ایک شور بے اماں میں گم کردیا گیا۔

اس سمپوزیم کے شرکا: سارتر، فشر، گولڈاسٹکر اور کندیرا کے ذہنی تجربے اس آئینہ خانے کی مثال ہیں جس کے درودیوار میں روایت زدہ ترقی پسندی کی معصومانہ ضدوں کا عکس دیکھا جاسکتا ہے۔ سمپوزیم کے شرکا کا تعارف یہاں غیر ضروری ہے کہ اردو زبان اب اتنی کم مایہ بھی نہیں کہ یہ نام اس کے لیے 'خبر' کی حیثیت رکھتے ہوں۔ پھر بھی، کچھ بزرگوں اور دوستوں سے تعاون کی خاطر یہ چند جملے:

سارتر: فلسفی، ناول نویس، ڈرامہ نگار، کہانی کار، کچھ لوگوں کے نزدیک ایک پمفلٹ باز قسم کا صحافی، ایک سرگرم سیاسی کارکُن، سیاسی اور تہذیبی معاملات میں جا وبے جا مداخلتوں کا قصور وار ادیب۔ مارکسی یا 'انسانیت پسندانہ وجودیت' کا مخترع، جس کے نزدیک وجودیت مارکسزم کے

دائرے میں گھر پھر کر گردش کرتی رہتی ہے۔ سارتر کے نقاد اس دائرے کو مملکت غیر سے تعبیر کرتے ہیں۔ خود سارتر کبھی اس دائرے میں شاد کام نظر آتا ہے، کبھی باہر کی دنیا سے تانک جھانک بھی کرتا ہے۔

فِشر: جنم آسٹریا میں ہوا۔ گراز کے مقام پر فلسفے کی تعلیم پائی اور ایک کارخانے میں غیر تربیت یافتہ، معمولی مزدور کی حیثیت سے کام کیا۔ 1927 میں Arbeiter-Zeitung کے اسٹاف میں شامل ہو گیا۔ اس سے وابستگی 1934 تک رہی۔ سوشلسٹوں نے جب فاشزم سے سازباز شروع کی تو سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کے اندر بائیں بازو کے اپوزیشن کی تشکیل میں تعاون کی خاطر وہ کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو گیا۔ کچھ عرصے کے لیے جنگ کے بعد کی آسٹریائی حکومت میں وزیر تعلیم کی حیثیت سے بھی شامل رہا۔ اگست 1968 میں جب فوجی دستوں نے چیکوسلواکیہ کی سرزمین پر قدم رکھے، فشر معترض ہوا، پس معتوب ہوا اور کمیونسٹ پارٹی سے نکال دیا گیا۔ مشہور ترین اور (بد نام ترین) دو کتابیں: Art Against Ideology اور The Necessity of Art ہمارے ترقی پسند دوست اُسے 'تحریف پسندوں' میں شمار کرتے ہیں۔

گولڈ اسٹکر: 1963 میں Liblice میں شیکوسلواکیہ کی مشہور کافکا کانفرنس کا مہتمم اور مرکزی مقرر۔ ادبی حقیقت پسندی اور ابدی پابندیوں کے مسئلے پر مشرقی یورپ میں پھر سے سوچ بچار کا چلن اسی کانفرنس سے عام ہوا۔ استالینی فریم اپ کے نتیجے میں پانچویں دھے کے کچھ دن جیل میں گزارے۔ 1968 میں چارلس یونیورسٹی کا وائس ریکٹر اور ادیبوں کے انجمن کا صدر تھا جب وارسا پیکٹ کے بعد جلا وطنی اس کا مقدر بنی۔

کندیرا: ایک معروف چیک ناول نویس، کہانی کار اور ڈرامہ نگار، پراگ ڈرامہ اکادمی کی فلم فیکلٹی میں تعلیم پائی پھر پلٹ کر وہیں تعلیم دینے کا منصب قبول کر لیا۔

شمیم حنفی

ژاں پال سارتر

میں زوال پرستی کے موضوع پر بڑی خوشی سے گفتگو کروں گا۔ لیکن پہلے ہمیں وہ غلط فہمیاں جو آپ سب میں نہیں بلکہ ہمارے چند کمیونسٹ دوستوں میں پھیلی ہوئی ہیں، رفع کر دینی چاہئیں۔ میرا اشارہ کچھ سوویت مصنفوں کی جانب ہے جنہوں نے پچھلے برس لین گرڈ کے مقام پر یورپین ادیبوں کی کانفرنس میں سرمایہ دار ملکوں کے فن میں زوال پرستی کے سوال پر بحث کی تھی۔ میں اس بات کی وضاحت کرنا چاہوں گا کہ زوال پرستی کا تصور ہمارے کام میں آخر کیوں زبردست مسئلے پیدا کر دیتا ہے۔ دراصل یہ ضروری ہے کہ اس مسئلے پر بہت سنجیدگی سے غور کیا جائے۔ ہمیں اسے ٹالنا نہیں چاہیے۔ آپ نے بہت صحیح کہا کہ چیکوسلواکیہ عظیم ثقافتی روایات اور مارکسی افکار کا نقطۂ اتصال ہے۔ اس طرح یہاں ہمارے لیے یہ ممکن ہو سکے گا کہ زوال پرستی جو کردار ادا کر سکتی ہے ہم اس کا تعین کریں۔ مغرب میں ایسے لوگ بھی ہیں جو انفرادی یا اجتماعی سطح پر اس نوع کی جستجو میں مصروف ہیں۔ یہ لوگ ریڈیکل دانشور ہیں، اشتراکی ہوں یا نہ ہوں۔ اس کی بہت ساری قیاسی مثالوں میں سے میں یہاں اپنی ہی مثال پیش کرتا ہوں۔

میرا جنم ۱۹۰۵ میں ہوا۔ میری پرداخت میرے دادا کے ہاتھوں ہوئی جو ایک پروفیسر تھے اور ایسے بہتیرے خیالات رکھتے تھے جنہیں انیسویں صدی میں قبول عام کی سند حاصل تھی۔ میری نشو ونما ایک ایسی دنیا میں ہوئی جس پر علامت پرستی کے ادب اور فن برائے فن کے تصور کا غلبہ تھا۔ مغربی فلسفے کے وہ تمام افکار جن کا میں نے مطالعہ کیا تھا، میں نے قبول کر لیے۔ لیکن رفتہ رفتہ میں اس کلچر سے لاتعلق ہوتا گیا گرچہ اس کے بعد مخصوص عناصر میں نے اب تک محفوظ رکھے ہیں۔ اس طرح، دھیرے دھیرے، ان تمام باتوں کے ساتھ جو میں نے اس وقت تک سیکھی تھیں، میں مارکسزم تک آیا۔ دوسری باتوں کے علاوہ، میرا خیال ہے کہ یہ میرا فرائڈ، کافکا اور جوائس (یہاں یہ تین نام میں نے اس وجہ سے لیے ہیں کہ لینن گراڈ میں سب سے زیادہ ذکر انہی کا ہوا تھا) کا مطالعہ تھا جس نے مجھے مارکسزم تک پہنچایا۔ لیکن جب کچھ مشرقی (مشرقی یورپ کے) دانشور لینن گراڈ میں بلاتفریق ان تینوں کو زوال پرست کہہ کر صرف اس لیے مطعون کرتے ہیں کہ ان کا تعلق ایک زوال پرست معاشرے سے تھا، تو مجھے یہ خیال آتا ہے کہ میرا اپنا ثقافتی پس منظر بھی (اس زاویۂ نظر سے) 'غیر قانونی' ہے اور یہ کہ مجھے اپنے سوویت دوستوں سے اس امر کے پیش نظر

معذرت طلب ہونا چاہیے کہ میں نے ان تینوں مصنفوں کا مطالعہ کیا ہے، ان کی شناخت کی ہے اور انہیں پسند کیا ہے۔ مثال کے طور پر، جب کچھ حضرات جوائس پر زوال پرستی کے تصور کا اطلاق کرتے ہیں تو ان کی تنقید ایسے لوگوں کے لیے جنہوں نے جوائس کو نہیں پڑھا ہے، ایک رسوماتی نوعیت کی حامل ہو جاتی ہے۔ فی الوقت جو بات اہم ہے، اصلاً یہ نہیں ہے کہ زوال پرستی کے مسئلے کا گہرائی کے ساتھ جائزہ لیا جائے، بلکہ یہ ہے کہ ایک سوچے سمجھے نقطۂ نظر سے اس کا تجزیہ کیا جائے۔ لیکن وہ لوگ جنہوں نے زوال پرستی کا سوال اُٹھایا ہے۔ مغرب کے وہ ادیب جو وہاں مدعو کیے گئے ہیں۔ اپنی افادیت کھو بیٹھے ہیں۔ ایسا اس لیے ہے کہ یہ لوگ پہلے ہی یہ کوشش کر چکے ہیں کہ ان مصنفوں میں ان تمام عناصر کو جو بورژوا قرار دیے جا سکیں اور ان تمام باتوں کو جو ایک سوشلسٹ سماج میں قابل قبول نہ ہو سکیں، سرے سے ختم کر دیا جائے! انہوں نے ایک طرف تو یہ کچھ کیا ہے اور دوسری طرف بیک وقت ان کی معنویت کو قائم رکھنے کی کوشش بھی کی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ معنویت آج ہم سب کے لیے بہت قیمتی ہے۔

میں نہیں سمجھتا کہ مغرب کے ترقی پسند ادیبوں نے پروست اور کافکا جیسے چند مصنفوں کے مطالعے کی وجہ سے کوئی مخصوص بیماری پکڑ لی ہے۔ اس کے برعکس، واقعہ یہ ہے کہ چاہے وہ ترقی پسند ہوں یا مارکسی، ان ادیبوں کا مطالعہ کرنے کے باوصف بلکہ اسی کے سبب وہ اس بحث کو چلانے کا حق رکھتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان ادیبوں کا سارا لیکھا جوکھا ہم آنکھیں بند کر کے سچ مان لیتے ہیں، نہ ہی اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی سچا مارکسی ہمیں یہ بتانے سے قاصر ہے کہ ان مصنفوں کا مطالعہ کسی دوسرے نقطۂ نظر سے کیونکر کیا جائے۔ اس کے برخلاف متذکرہ واقعے سے یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ (متنوع افکار کا) ایک ناگزیر امتزاج اختلافات اور بحث مباحثے ہی کے نتیجے میں سامنے آ سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر ہم واقعی یہ سمجھتے ہیں کہ اینٹی مارکسسٹ بورژوا کے مقابل خود مارکسیوں میں بھی سوچ بچار کی استعداد رکھنے والے لوگ موجود ہیں تو اپنی گفتگو میں ہمیں ایسے لوگوں کو مسترد نہیں کرنا چاہیے جن کی ترجمانی میں کر رہا ہوں۔ سوچ بچار کی استعداد رکھنے والوں سے میری مراد ان لوگوں سے ہے جو اسی بورژوا کلچر کی پیداوار ہیں، ہر چند کہ اس کے مخالف بھی ہیں۔

میرا خیال ہے کہ اب آگے بڑھنے سے پہلے ہم قیاساً زوال پرستی کے تصور کو مسترد کر دیں۔ یہ تو بیّن ہے کہ زوال پرستی کا ایک اپنا وجود رہا ہے۔ سلطنت روما کے خاتمے پر ایک دور

تھا جب صرف اس سبب سے فن کی زوال پرستی پر گفتگو کی جا سکتی تھی کہ فن کی تخلیق کرنے والے فن کے ہیئتی ارتقا کے ایک مخصوص تصور میں بند پڑے تھے۔ اس عہد کے بڑے بڑے سنگ تراش اپنے پیش روؤں کی تکنیکی مہارت تک رسائی سے قاصر تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ ''میں ایک آدمی کا بُت بنا سکتا ہوں، گھوڑے کا پیکر تراش سکتا ہوں مگر یہ نہیں جانتا کہ آدمی کو اس گھوڑے پر سوار کیسے کیا جائے؟'' یہ سب کچھ مربوط ہے طبقوں میں بٹے ہوئے معاشرے سے نیز اس معاشرے کی اس معذوری سے کہ وہ کچھ نیا تخلیق کرنے کے قابل نہیں رہ گیا۔ زوال پرستی کے تصور کی تعریف اور اس تعریف کا اطلاق صرف ایک خالص فنی بنیاد پر کیا جا سکتا ہے۔ اس سوال کا کہ ''کیا فن زوال پرست ہو سکتا ہے؟'' میں یہ جواب دوں گا کہ ہاں، ہو سکتا ہے۔ لیکن صرف اس صورت میں جب اسے صرف اسی کے فنی معیار پر پرکھیں۔ اگر ہم جوائس، کافکا اور پکاسو کو زوال پرست ثابت کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے ہمیں اصلاً انہی کے کارناموں کو بنیاد بنانا پڑے گا۔ صرف اسی صورت میں اور مارکسیوں کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے۔ ہم تاریخ کے سیاق اور معاشرے کے عالمی ڈھانچوں کو نظر میں رکھتے ہوئے یہ سمجھ سکیں گے کہ اس مظہر کی نمود کیونکر ہوئی؟

اس طریقِ کار کا اطلاق اگر ہم کسی مخصوص مصنف یا کسی مخصوص عہد پر کریں تو یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ زوال پرستی کا تصور شاذ ہی معنویت کا حامل ہوتا ہے۔ یہ کہنا کہ وہ مصنف جن کی ہم بات کر رہے ہیں محض اس واسطے زوال پرست ہیں کہ ان کا ربط ایک زوال پرست معاشرے سے تھا گھوڑے کے آگے گاڑی جوتنے کے مترادف ہے، کیونکہ روز بہ روز ہم پر یہ حقیقت زیادہ سے زیادہ روشن ہوتی جا رہی ہے کہ سرمایہ داری ایک طاقت ور درندہ ہے۔ کیا ہم سچائی کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ سرمایہ داری دیوالیہ ہے۔ میں تو نہیں کہہ سکتا۔ ہمیں یہ سوال اور آگے بڑھ کر سمجھنا ہوگا۔ اس واضح بنیاد پر سرمایہ داری کا خاتمہ یقینی ہے کہ قوتِ خرید کے زوال اور زائد پیداوار کے مابین فی نفسہ ایک تضاد موجود ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اوقاف نے خود کو حالات کے مطابق ڈھال لیا ہے اور یہ کہ ان کا وجود قائم ہے۔ سرمایہ داری آج بھی مجھے اتنی ہی غیر انسانی اور ذلیل نظر آتی ہے جیسی کہ پہلے تھی، لیکن اگر ہم انیسویں صدی کی 'خاندانی سرمایہ داری' سے اس کا موازنہ کریں تو میرے نزدیک اسے زوال پرست کہنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہ جاتا۔ میں یہ تو کبھی نہ کہوں گا کہ سائنسی مارکسیت محض اُس منصوبہ بند طریقِ کار کے باعث ناکام ہوئی جسے سوشلسٹ ملکوں نے شخصیت پرستی کے دور میں اختیار کر رکھا تھا۔ اس کی بجائے، میں یہ کہوں گا

کہ اس میں کج رائی پیدا کر دی گئی، اسے ادعائی بنا دیا گیا۔ یہاں بغیر کسی جواز کے 'زوال پرستی' کی اصطلاح کا استعمال کوئی کیوں کرے؟ کیا صرف اس لیے کہ بعض حالات میں، یا بعض اشخاص میں، یا بعض حلقوں میں چند مخصوص عملی اور سیاسی اسباب کے تحت مارکسیت اپنا دَم خم کھو بیٹھی ہے؟ بہت سے ایسے علاقے بھی ہیں جہاں اسے اُبھرنے کا موقع ملا ہے۔ دوسرے افراد بھی ہیں جنھوں نے اسے ترقی دی ہے اور یہ بات طے ہے کہ اس کی طاقت میں روز بہ روز اضافہ ہو رہا ہے۔ رومن آرٹ کے زوال سے، جس کا مفہوم زوال مطلق تھا، اس کا کوئی تعلق نہیں۔ رومن آرٹ کے کھنڈروں پر وحشیانہ (barbaric) آرٹ کو فروغ حاصل ہوا لیکن یہاں بھی اس معاملے سے کلّی تشابہ کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔ اسی لیے میں یہ مشورہ دوں گا کہ مشرق و مغرب کے درمیان بحث سے زوال پرستی کے تصور کو باضابطہ طور پر خارج کر دیا جائے اور اسے صرف ان موقعوں پر استعمال کیا جائے جہاں فنی زوال پرستی کی واقعۃً تصدیق کی جا چکی ہے۔ ہمیں کسی بھی طرح کے بازاری نعروں کے استعمال سے بچنا چاہیے۔ بصورت دیگر، میں یہی سمجھوں گا کہ یہ صحیح معنوں میں ایک مارکسی تصور نہیں ہے اور یہ بھی کہ ہماری گفتگو میں اس (اصطلاحوں کے استعمال) سے کوئی بھی مقصد پورا نہیں ہوتا۔

ہم، جو مغربی ریڈیکل (کہلاتے) ہیں، یہ نہیں مان سکتے کہ کچھ مصنفین مثلاً: پروست، کافکا یا جوائس جن کی شخصیتوں کو اسی معاشرے نے ڈھالا ہے جس نے ہمیں بنایا اور جنھیں ہم ٹاٹ باہر کرنے پر تیار نہیں ہیں، زوال پرست سمجھے جائیں کیونکہ ایسا کرنا بیک وقت اپنے ماضی کو مطعون کرنے کے مترادف بھی ہوگا اور اس مذاکرے میں ہماری شمولیت کی کسی بھی قدر کے منافی ہوگا۔ ماسکو کے انسٹی ٹیوٹ آف فلاسفی میں مجھ سے کہا گیا کہ کسی زوال پرست معاشرے میں ایک فرد ایک ساتھ کئی جہتیں اختیار کر سکتا ہے، ان میں سے ایک جہت ترقی پسندانہ بھی (ہو سکتی) ہے۔ پس اگر کوئی فنکار کسی ترقی پسند تحریک کی تشکیل کرتا ہے تب تو وہ زوال پرست نہیں ہے، بصورتِ دیگر وہ زوال پرست ہے۔ یہ ایک زبردست سہل پسندی ہے کیونکہ اگر اسی معاشرے میں، جسے زوال پرست کہا جائے، ایک ترقی پسندانہ جہت بھی موجود ہے تو پھر اسے لازماً کسی نہ کسی تعداد میں ایسے فن کاروں کو متاثر کرنا چاہیے جو عملی زندگی میں ترقی پسند نہ سہی لیکن جو تضادات کا شعور رکھتے ہیں اور جنھیں حتی الوسع ان تضادات سے مطابقت پیدا کرنی چاہیے۔ میں یہاں ایک بات پھر دہراؤں گا۔ یہ کہ زوال پرستی کا تصور اپنی گفتگو سے خارج کر دیا جائے۔ اس امر پر اصرار میں اس

لیے کر رہا ہوں کہ اس پر مغرب کے بائیں بازو سے اشتراک عمل کا انحصار ہے۔ زوال پرستی کے تصور کو قبول کر لینے کا مطلب عملاً یہ ہوگا کہ ہمارا آزادیِ اظہار کا حق چھن گیا ہے یا کم از کم یہ کہ مارکسیت سے ہمارا تعہد واضح نہیں ہے جیسا کہ مثلاً پچھلے پندرہ برسوں میں خود میرا حال رہا ہے۔ اگر ہم اس تصور کو مسترد کر دیں یا اسے کم از کم سنجیدہ اور مفصل مطالعوں کے لیے بہترین معیار کے ساتھ مخصوص کر دیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک ترقی پسندانہ کلچر کو دوسرے ترقی پسندانہ کلچر سے رابطہ قائم کرنے کے مواقع حاصل ہوں گے۔ اصل بات یہ ہے کہ ایک رجعت پرست ادیب کو ایک ترقی پسند ادیب کے بالمقابل نہ لایا جائے۔ ان میں اشتراک کا کوئی نقطہ ہے ہی نہیں۔ اصل میں دیکھنا یہ ہے کہ مغرب کے بائیں بازو اور مشرقی سوشلسٹوں میں کوئی مفاہمت پیدا کی جا سکتی ہے یا نہیں اور یہ کہ کیا ایک متحدہ محاذ قائم کرنا ممکن ہو سکے گا؟

ژاں پال سارتر ہماری توجہ عہد قدیم کی زوال پرستی تک کھینچ لے گئے ہیں۔ مجھے اس بات کی بڑی خوشی ہے کیونکہ میں نے خود اپنے زوال پرستی کے مطالعہ میں جدید اور قدیم زوال پرستی سے بحث کی ہے۔ ان میں فرق یہ ہے کہ قدیم زوال پرستی حقیقی زوال پرستی تھی کیونکہ اس زمانے میں کوئی بھی نئی تخلیقی قوت نہیں اُبھری اور معاشرے کے کسی بھی طبقے کو اس امر سے دلچسپی نہیں ہوئی کہ پہلے اس کی کیا حالت تھی۔ وہ زمانہ تناظر اور امید سے یکسر عاری تھا۔ سلطنت روما نے ایک مدافعانہ رویہ اختیار کر لیا تھا اور ایک بھی شخص ایسا نہ تھا جو اُس عہد کے سماجی تضادات کا کوئی حل تلاش کر سکتا۔ کلیسا کے محافظوں نے سلطنت روما کے دور آخر کے Pagan ادیبوں کی مانند بڑے بجھے ہوئے لہجے میں اس موضوع پر اظہار خیال کیا ہے۔ ان کے نزدیک وہ دَور ایک ایسے زنداں سے مماثل تھا جس میں صرف دریچے بیرونی دنیا کی طرف کھلتے تھے۔ بہرنوع، صنعتی انقلاب کے زمانے سے پیداواری قوتوں نے کسی مزاحمت کے بغیر فروغ پایا ہے۔ میرے خیال میں ذرائع پیداوار اور پیداوار کے متروک رشتوں کے مابین مسلسل پایا جانے والا تضاد۔ وہ تضاد جس پر مارکس نے بہت زور دیا ہے، فن اور ادب کے لیے بیحد اہمیت کا حامل ہے۔ ہم سامراجیت کی منزل پر سرمایہ داری کی پیداواری طاقتوں کا زبردست فروغ دیکھ چکے ہیں، اور یہ سوچنا محال ہے کہ کوئی ایسی صورت حال ابدالآباد تک بغیر کسی تبدیلی کے قائم رہ سکتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انسانیت کو ایک ایٹمی جنگ کے امکان کا دھڑکا لگا ہوا ہے، جو اسے تباہ کر دے گی۔ لیکن ان جدید پیداواری طاقتوں کو انسانیت کی خدمت پر لگانے کی صورت میں اس تباہی سے بچاؤ کا ایک امکان بھی دکھائی دیتا

ہے۔

سرمایہ داری جاں بلب ہے۔ لینن نے انہی لفظوں میں سامراجیات کی وضاحت کی تھی۔ لیکن یہ درد تو ایک طویل تاریخی تسلسل ہے جو لازمی طور پر فن اور ادب کے انحطاط کا احاطہ نہیں کرتا۔ گزشتہ صدی کے خاتمے پر، جس کا تجزیہ لینن نے اپنے سامراجیت کے مطالعے میں کیا ہے، دراصل زوال پرست عناصر کو ہی غلبہ حاصل تھا اور اس وقت مقتدر سماجی مرتبے کا وہ مالک تھا جو صاحبِ املاک ہو۔ لیکن اس وقت بھی بورژوا دنیا میں تضادات موجود تھے۔ وہاں ہوئس مین کی مطلق زوال پرستی تھی جو Dreyfus Affair کے موقعے پر ایک راسخ العقیدہ کیتھولک بن بیٹھا، D'Annunzio کی زوال پرستی تھی جس نے چھبیلے پن (Dandyism) اور حکمراں طبقے کی آرام طلبی کا جشن منایا۔ Cocottes کی زوال پرستی تھی جس کا راگ مکتبی مصوروں کی تصویروں میں الاپا گیا ہے۔ لیکن وہاں زولا اور روڈن کا بنایا ہوا بالزک کا مجسمہ، اور سیزاں، اور کیوبزم بھی تھے جو سب کے سب فن کے انحطاط کے مخالف تھے۔ دستاویز بندی کے مقصد سے ان مثالوں کو کئی گنا ضرب دیا جا سکتا ہے، یہ دکھانے کے لیے کہ ایک زوال پرست دور میں مخالف قوتوں نے کس طرح لوگوں کو اپنی آواز بلند کرنے پر مائل کیا۔ اور پھر، لوگ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ لینن نے اپنے سامراجیت کے مطالعے میں حسب ذیل اشارہ بھی کیا تھا: ''یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ اجارہ کی جانب یہ میلان سرمایہ داری کے تیز رفتار فروغ کو مستثنیٰ کر دیتا ہے۔ بہت سی صورتوں میں اس کا فروغ اور زیادہ تیزی کے ساتھ ہوتا ہے۔'' ذرائع پیداوار کی بے روک ترقی جمود کو راہ نہیں دیتی۔ خاص طور سے آخری دہوں میں سوشلزم سے مقابلے کی وجہ سے سرمایہ داری کو توسیع کے نئے وسائل کی جستجو پر مجبور ہونا پڑا ہے۔

جدید صنعتی معاشرے کے ایک تجزیے سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اس کے غیر محسوس ڈھانچے اور اس کی ناگزیر ضرورت کا تعین سوشلزم کرتا ہے۔ یہ نئی سچائی فن اور ادب کو ایک نئی قوت سے ہم کنار کرتی ہے۔ ہمارے متعدد دوست ایسے بھی ہیں جو بدقسمتی سے، اس حقیقت کو جدلیاتی طور پر دیکھنے کے بجائے میکانکی طور پر دیکھتے ہیں: ''ہمارا معاشرہ زوال پرست ہے اس لیے اس کے فن اور ادب کو بھی زوال پرست ہونا چاہیے۔'' یہ مفروضہ ہمارے عہد کے ناگزیر اور مستقل تضاد، یعنی پیداواری طاقتوں اور پیداواری رشتوں کے مابین تضاد کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ وہ لازمی سماجی تقطیب جو فیصلہ کن ثابت ہوگی محنت کش طبقے اور بورژوازی کی ہوگی۔ تمام اچھے فن

کاروں اور ادیبوں کے تاثرات اور شعور پر اس کا اثر ڈالنا لازمی ہے، ذرائع پیداوار بار بار پیداواری رشتوں پر غالب آئیں گے۔ منسوخ کیے ہوئے افکار سے ہم ایک نئی سچائی کھینچ نکالیں گے۔ ایک موثر مثال دیکھیے: پیرس میں ۱۸۸۹ کے عالمی میلے کا آغاز تقریباً اسی وقت ہوا جسے لینن نے سامراجیت کے حرف آغاز سے تعبیر کیا تھا۔ ایک طرف ہم ایفل ٹاور، Palace of Industry اور تکنیکی تعمیرات کے مسحور کن مظاہر اور پیدوار کے شاندار اور نئے وسائل کا بے پایاں تناظر دیکھتے ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ اس نے فن کو کیا جادو، کیا توانائی اور کیا وسعت عطا کی۔ اور دوسری طرف پناما نہر کا اسکینڈل اور پیداواری رشتوں کا زوال ہے۔ ایک طرف پیداواری طاقتوں کا فروغ ہے جو اپنے اندر مستقبل کا بیج چھپائے ہوئے ہیں اور دوسری طرف ذرائع پیداوار کی سڑن اور کھوٹا پن بھی ہے جس کا فن اور ادب پر ایک اثر ہوتا ہے۔ وہ شخص جو متروک فیصلوں سے الگ ہو کر فن اور ادب کے ارتقا کی جدلیات پر نظر ڈالتا ہے اس نتیجے تک پہنچتا ہے کہ مطلق زوال پرستی کا کوئی دَور نہ تو اب سے پہلے رہا ہے، نہ ہی آئندہ ہو سکتا ہے۔ ان ادوار میں، جب زوال پرستی کی لہریں غالب دکھائی دیں، ہر بار ایک مدافعانہ تحریک نے بھی سر اُٹھایا جو انجام کار ہمیشہ قوی ترین ثابت ہوئی۔ کوئی بھی اہم فن کار اور ادیب تخلیق کا آغاز ہمیشہ سچائی سے کرتا ہے، ان کی تمام تر کلیّت کے ساتھ اور مستقبل ماضی کی بہ نسبت ہمیشہ زیادہ با اثر اور طاقت ور ہوتا ہے۔

پس ہمیں زوال پرستی کے مسئلے تک منطق کے ماہرین کی طرح جانا چاہیے۔ D'annunzio جیسے ادیب جو ایک ملعون صورت حال کے ملعون موید تھے، انہیں اکثر بیکیٹ جیسے ادیبوں کے ساتھ خلط ملط کر دیا جاتا ہے۔ بیکیٹ ایک اخلاق پرست ہے جو زیر بیان صورت حال کے سلسلے میں قطعاً پُر جوش نہیں ہوتا۔ یہ D'annunzio کی طروح زوال پرستی کے فریب زدہ پذیرائی نہیں بلکہ دہشت اور مایوسی ہے۔ بیکیٹ کی مطلق ''نہیں!'' (یا نفی) دھماکا خیز ہے، چونکا دینے والے اضطراب سے معمور، جو ایک صحت مند کراہت اور عمل میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ اگر بیکیٹ نے ENDGAME میں ایک بھی مثبت کردار شامل کر دیا ہوتا تو ہم اس سے مطمئن ہو جاتے اور مطلوبہ تاثر غارت ہو جاتا۔

یہ بات متناقضانہ ہے کہ بیکیٹ متعصّب اور ادعائیت زدہ کمیونسٹوں کی طرح بورژوازی کو یا تو نزع میں گرفتار دکھاتا ہے یا پھر پہلے ہی سے مرا ہوا۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جو اسے مجسّم زوال پرست کہہ کر اس پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ پرانے زمانوں میں بھی ایسی مکمل نفی کا اس درجہ افسوسناک

نمایاں لے کے ساتھ وجود نہ رہا ہوگا۔ پھر بھی، ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اس نفی کو مسترد کرتے ہیں۔ اس کے ڈراموں کے انفعالیت زدہ کرداروں کے بالمقابل پبلک وہ فعال طاقت ہے جو کسی فیصلے تک پہنچنے کا تقاضہ کرتی ہے۔ یہ اعتراض جائز طور پر کیا جاسکتا ہے کہ ''درحقیقت صورت حال اتنی امید شکن نہیں ہے۔'' لیکن متذکرہ جواب سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوسکتا۔ صدمہ زدہ ناظر یہ پوچھ سکتا ہے کہ ''کیا صورت حال اس درجہ تاریک ہے؟ کیا ہم اس ENDGAME؟ اس بربادی کا سدّ باب کرسکتے ہیں؟'' اس نوع کے سوال اُٹھانا اور اس قسم کے میلانات کو اُبھارنا، میرے نزدیک مارکسی نقاد کا فریضہ ہے۔ اگر ہم نوجوانوں کو یہ بتائیں کہ جوائس سے بیکیٹ تک ایک زوال پرستی کے واا اور کچھ بھی نہیں تو ہم سرمایہ دار ملکوں کے نوجوانوں کو نہتا کردینے کے قصوروار ہوں گے کیونکہ وہ کسی تریاق کے بغیر ہی اس زہر کو نگل جائیں گے۔ ہمیں D'Annuzio اور بیکیٹ کے مابین ہی نہیں، بلکہ بیکیٹ اور آئیونسکو کے مابین اختلافات کی وضاحت بھی کردینی چاہیے، وہ اختلافات جو بورژوا دنیا کے ایک ثناخواں ایک درباری مسخرے اور ایک شورہ پشت منکر کے مابین پائے جاتے ہیں۔ ہم میں یہ کہنے کا حوصلہ ہونا چاہیے کہ اگر ادیب زوال پرستی کا بیان اس کی تمام تر برہنگی کے ساتھ کرتے ہیں اور اگر وہ اخلاقی سطح پر اسے ملامت کا ہدف بناتے ہیں تو یہ زوال پرستی نہیں ہے۔ ہمیں نہ تو پروست کو بورژوا طبقے کے سپرد کرنا ہے، نہ جوائس کو، نہ بیکیٹ کو، حتّٰی کہ کافکا کو بھی نہیں۔ اگر ہم نے انہیں یہ اجازت دے دی تو وہ ان ادیبوں کو ہمارے ہی خلاف صف آرا کردیں گے۔ بصورت دیگر یہ ادیب اب بورژوازی کے معاون نہ ہوں گے، یہ ہم ہوں گے جنہیں ان کا تعاون حاصل ہوگا۔

ایڈورڈ گولڈ اسٹکر :

ژاں پال سارتر نے زوال پرستی کے سوال پر جو کچھ کہا مجھے ابھی اس پر سوچ بچار کرنا ہے۔ لیکن انہیں سنتے وقت مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں ان سے متفق نہیں ہوں۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ جدید فن میں زوال پرستی نہیں ہے۔ وہ ارتقا پسند خاکہ جو کامریڈ فشر نے اس عمدگی کے ساتھ ہمارے لیے ترتیب دیا ہے۔ میں اس میں یہ اضافہ کرنا چاہوں گا کہ صنعتی انقلاب سے لے کر آج تک، سرمایہ دار معاشرے کا ارتقا اختیار کے عہدوں سے بعض سماجی طبقات کے اخراج کا ایک مسلسل عمل رہا ہے۔ اولاً طبقۂ اُمرا زد پر آیا، پھر بورژوازی کے مختلف طبقے۔ اس کا ثبوت سب سے پہلے رومانی عہد میں سامنے آیا جب اُمرا کے ایک حلقے نے اعلیٰ

درجے ک ادب تخلیق کرنے کے ساتھ ساتھ زوال پرستی کے ناقابلِ تردید نشانات بھی ظاہر کیے۔ مثال کے طور پر یہاں شاتوبریاں، نوواس، حتّی کہ Kleist جیسی عظیم شخصیت کا نام پیش کرنا کافی ہوگا۔ انیسویں صدی میں وہ طبقہ جس کی خوش گمانیوں کے سحر کا ازالہ ہوا، کم رُتبہ بورژوازی کا انتہائی خوش ذوق طبقہ تھا کیونکہ ۱۸۴۸ء کے انقلاب کی تمام عظیم امیدوں کا خاتمہ بس ایک خودغرض، تجارتی ذہن رکھنے والے معاشرے پر ہوا۔ اس طبقے کے فن کاروں کا ردِعمل معاشرے سے ایک مایوسانہ پسپائی تھی اور ان کے فن سے اس (پسپائی) کا اظہار ایک واضح زوال پرستی کی صورت میں ہوتا ہے۔

اس نوع کی سب سے بڑی اور انوکھی مثال شارل بودلیئر کی ہے۔ بحران کے دَوران میں، جس کا خاتمہ سرمایہ داری پر ہوتا ہے، خود بورژوا کیمپ کے اندر ایک تلخ کشمکش دکھائی دیتی ہے۔ لبرل سرمایہ داری کا پرانا طبقہ اقتصادی زندگی سے خارج ہوجاتا ہے اور اس کی جگہ ایک نئی قسم کی سرمایہ داری سامراجیت کو مل جاتی ہے۔ بورژوازی کا طبقۂ اعلیٰ، اوقاف اور سرمایہ کار سامنے آجاتے ہیں جبکہ کم رتبہ بورژوازی (متوسط طبقے) کا، ترقی کی اگلی صف سے اخراج ہوجاتا ہے۔ میں فن کے شعبے پر اس (تجزیے) کا اطلاق میکانکی طور پر نہیں کرنا چاہتا، لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ زوال پرستی کے عناصر اسی سلسلے (Process) سے پھوٹے ہیں۔ فرانز کافکا جیسا طبّاع اس ضمن کے متعدد مثالوں میں سے ایک ہے۔ میں چونکہ زوال پرستی کے عناصر پر گفتگو کر رہا ہوں اس لیے میرے خیال میں یہ بہتر ہوگا کہ اپنے خیال کی وضاحت کرتا چلوں۔ مختصراً یہ عناصر ہیں: مرکزی توانائیوں کا صریح خاتمہ جو دھیان (مراقبے) کے نام پر عملی زندگی کی تردید پر منتج ہوا، ایک جمالیاتی سریع الحسیّت، جینے کی لگن کا کھو جانا، قنوطیت۔ زوال پرستی سے میری مراد یہی ہے مجھے یقین ہے کہ اس کے اور بھی پہلو ہوں گے۔

گزشتہ ڈیڑھ صدی کے فن کاروں کے سلسلے میں اہم ترین بات یہ ہے کہ محض اپنے قنوطی اور فنا پرست میلانات کے تحت وہ زندگی کے اسرار کا زیادہ بھرپور طریقے سے تجزیہ کر سکے ہیں اور انہوں نے اپنی دنیا کو فنّی زبان دینے کی نئی جہتیں دریافت کی ہیں۔ یاں ہم زوال پرستی کے عناصر کی جدلیاتی وحدت اور فنّی تخلیق کے طریق میں نئی دریافتوں پر بحث کر رہے ہیں۔ پھر یہ دریافتیں کسی دوسرے فنکار کے ہاتھ لگ جاتی ہیں، وہ دنیا کے تئیں اپنے تصور کے معاملے میں کتنا ہی ترقی پسند کیوں نہ ہو۔ میں اسے حتمی طور پر ضروری سمجھتا ہوں کہ زوال پرستی کے مسئلے پر،

مارکسی ہونے کے ناطے ہمارا ایک اپنا موقف ہو جس کی بنیاد ہم اس جدلیات کو بنائیں جو اس میں گردش کرتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ زندگی کے فلسفے سے زوال پرستی کے عناصر کو ممیز کیا جائے، حیات اور کائنات کے تئیں یہ زوال پرست اور قنوط وژن اپنے ساتھ فنی تخلیق کی جو تکنیکیں لایا ہے اس کا تنقیدی نظر سے تجزیہ کیا جائے اور اُسے گہرائی سے سمجھا جائے۔ اس نوع کی فنی ترقی اسی نکتے کو ظاہر کرتی ہے جس پر ارنسٹ فشر نے زور دیا ہے اور جو یہ ہے کہ عظیم فن، خواہ وہ سرمایہ دار عہد کا ہی کیوں نہ ہو، ہم جیسوں کو بھی کچھ نہ کچھ بہم پہنچاتا ہے، اور یہ کہ اسے بیک قلم مسترد نہیں کیا جا سکتا۔

میں بس اتنا اور کہنا چاہوں گا کہ کمیونسٹوں کے اس مباحثے میں جس کا ذکر ابھی ژال پال سارتر نے کیا، سب سے مہلک بات رجائیت پسند اور قنوطیت پسند فن کاروں کی میکانکی تقسیم ہے۔ وہ ادب جس کی جانب میں نے مختصراً اشارہ کیا ہے اسے کلّی طور پر صرف اس لیے مسترد کر دیا جاتا ہے کہ وہ قنوطی ہے اور قنوطیت کی تبلیغ کرتا ہے۔ دلیل یہ دی جاتی ہے کہ چونکہ ہم جس معاشرے میں رہ رہے ہیں وہ سوشلسٹ اور کمیونسٹ نصب العین رکھتا ہے، اس لیے ہم قنوطیت سے کوئی کام نہیں لے سکتے پس ایسے ادب کو ہمیں مسترد کر دینا چاہیے۔ میں اس رویے کو میکانکی اور ادعائی سمجھتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ آج وہ وقت آ چکا ہے جب ہم اس رویے کو ایک ساتھ ہمیشہ کے لیے ترک کر دیں۔

ملان کندیرا:

مجھے خوشی ہے کہ ہم تصورات کے صحیح اور سائنٹفک صرف کی آرزومندی کے معاملے میں ایک ساتھ ہیں۔ ہم نے اپنے ملک میں زوال پرستی، ہیئت پرستی، مجدد پرستی وغیرہ جیسے تصورات کا استعمال اکثر اس طریق پر کیا ہے کہ یا تو یہ بے مغز ہو جاتے ہیں، اس طرح کہ انہیں کچھ بھی معنی پہنا دیے جائیں، یا پھر ان کے کوئی معنی نہیں رہ جاتے۔ ادعائیت کے زمانے میں چونکہ فکر صحیح معنوں میں ابھر نہ سکی اس لیے ارتقا کا تاثر پیدا کرنے کے لیے بھانت بھانت کی بے معنی اصطلاحیں مضحک طریقے سے استعمال کی گئیں۔ یہ سلسلہ اس حد تک گیا کہ اس دور کا کوئی مضمون پڑھتے وقت اس کی تاریخ کا تعین ہم اس کے نظریاتی مواد سے نہیں بلکہ استعمال شدہ اصطلاحات سے کر سکتے تھے، مثلاً: ہیئت پرستی، زوال پرستی، تحریف پسندی یا لبرل ازم وغیرہ۔ اس اصطلاحیات کا یہ رول موضوعاتی جارگن (کے رول سے) مماثل تھا۔ اسنے فلاں یا فلاں دور کے اوصاف کی نشاندہی کی۔ وہ کامریڈس جو یہاں موجود ہیں، انہوں نے یہاں آنے کے بعد سے یہ اندازہ یقیناً

لگا لیا ہوگا کہ وہ ادب جسے ہم زوال پرست کہتے ہیں اس کی بابت صحیح معنوں میں ایک جدلیاتی منزل تک ہم پہنچ گئے ہیں اور یہ کہ ہم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ نظریاتی جدّ وجہد انکار میں نہیں بلکہ مزاحمتوں پر قابو پانے کے عمل میں مخفی ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہاں تاریخی حالات ہمارے لیے سازگار رہے ہیں۔ ہم اس سکہ بند کلیشے کو رد کرنے میں کامیاب رہے ہیں جس کے مطابق آواں گارد رجعت پسندانہ سیاست کے مترادف ہے۔ یہ خیالات فی نفسہ چیکوسلواکین آواں گارد کی تاریخ ہیں۔ میں اپنے دوستوں کا دھیان اس طرف موڑنا چاہتا ہوں، کیونکہ، آواں گارد پر بین الاقوامی مباحث میں، اور سب سے زیادہ اطالویوں اور لوکاچ کے مابین، چیکوسلواکین آواں گراد ایک اہم مثال فراہم کرتا ہے۔ اولاً اس لیے کہ یہ آواں گارد، اسے خواہ سررئیلزم، سمبلزم سے جوڑا جائے یا اس کی خانہ بندی سے انکار کر دیا جائے، کمیونسٹ پارٹی سے قریبی ربط رکھتا ہے۔ ثانیاً، چونکہ چیکوسلواکین آواں گارد کی سب سے بڑی شخصیتوں نے اس امر کا اظہار کیا ہے کہ آواں گارد کو حقیقت پسندی کی ایک مطلق اینٹی تھیسس کے طور پر دیکھنا مہملیت ہے۔ محض انہی کی بدولت یہ پتہ چلا کہ جدید فن کے گہرے میلانات کی وساطت سے، فن کی اس نوع تک کیونکر پہنچا جا سکتا ہے جو دنیا کا احاطہ اس کی تمام تر کلیت کے ساتھ کر سکتی ہے۔

ایک پچھلے انٹرویو میں سارتر نے البیر کامیو کے ناول THE PLAGUE کا ذکر کیا ہے۔ اس واقعے پر وہ کچھ حیران ہوئے تھے کہ ہمارے ملک میں اس کتاب کا خیر مقدم اتنے پرجوش انداز میں ہوا۔ میرا خیال ہے کہ اسی سے ہماری صورت حال کی نشان دہی ہوتی ہے۔ ادعایت کے خلاف جدوجہد میں ہم اکثر بغیر کسی شرط کے ہر اس بات کی مدافعت کے نقطے تک جا پہنچے جس بات سے ادعائیت پرستوں نے انکار کیا، تاکہ ان تمام تخلیقات کی اشاعت اور تقسیم کے عمل کو تیز تر کیا جا سکے۔ آج اس کا نتیجہ ایک خاص طرح کی انتخابیت پسندی ہے۔ ہمارے ملک میں اس وقت جب مغربی ادب کو بس 'مسترد' کر دیا گیا، اس ادب کی کچی تنقید کا وجود نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات، حتی کہ آج بھی، جب ہم اسے پڑھتے ہیں تو ہمارا رویہ، چاہے تحسین آمیز ہو یا تنقیصی، اس تنقیدی میلان کا بہت کم اظہار کرتا ہے۔

اس واقعے میں ایک متناقضانہ پہلو بھی شامل ہے کہ (آج) ہم انہی ژاں پال سارتر کے تنقیدی کارناموں میں سوچ کو غذا پہنچانے والی باتیں پاتے ہیں جنہیں اب سے پہلے ہمارے ملک میں یہ کہہ کر رد کر دیا گیا تھا کہ وہ ایک بورژوا ادیب ہیں اور ان کے یہاں مارکسزم سے

اشتراک کا کوی عنصر نہیں ہے۔ میں اس وقت علی الخصوص امریکی ناول کی نظریاتی اور اسلوبیاتی بنیادوں کی بابت ان کے بیانات، یا البئر کامیو کے THE STRANGER پر ان کے مضمون یا ان کے فاکز والے مضمون کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اس طرح سارتر، ان تمام افکار اور تخلیقات کے ضمن میں ہمیں ایک خاصا ستھرا تنقیدی رویہ اپنانے میں مدد دیتے ہیں جن پر عہد ادعائیت کے خاتمے کے بعد، آج ہم اپنے دروازے کھول دینا چاہتے ہیں۔

ارنسٹ فشر:

میں زوال پرستی کے سوال سے متعلق دو اور باتیں کہنا چاہوں گا۔ ہم زوال پرستی کی بنیادی شکلوں سے ایک یعنی کلیشے کے ذریعہ فن کی بربادی کے پہلو کو فراموش کر بیٹھتے ہیں، یا مجھے کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔ عظیم Delacroix کے مقلدوں میں مجھے ایک گہری زوال پرستی کا ادراک ہوتا ہے، اور اس خیال کی تائید میں ان گنت تصویروں کی مثال میں پیش کر سکتا ہوں۔ اس بات سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ THE BIRTH OF VENUS اور اسی جیسی دوسری تصویروں میں سماجی صوت حال نیز ایک خود نما، زرق برق اقلاف کے مابین جونسوانی پیکر کے لیے ندیدے پن کے ساتھ مضطرب دکھائی دیتا ہے، ایک تضاد موجود ہے۔ THE THIRD EMPIRE کی Cocotte ایک ہیروئن ہے۔ جو کبھی صداقت (Truth) کے روپ میں سامنے آتی ہے، کبھی آزادی (liberty) کے روپ میں، حتیٰ کہ تقدیر (Luck) کے روپ میں بھی اور یہ Nana کی وہ کامل نمائی ہے، اس کا وہ روپ ہے جس نے سچائی کی جگہ لے لی ہے اور جسے میں زوال پرست تصور کرتا ہوں۔ جرمنی میں زوال پرستی نے اپنا اظہار ایک دوسری شکل میں کیا۔ میرے خیال میں وہاں سامراجی زوال پرستی کی علامت ان یادگاروں کی شکل میں سامنے آئی جو اپنی دکھاوے کی سادگی اور تعمیری ڈھونگ پن کے ساتھ جنگ کا جشن مناتی ہیں۔ جس طرح فرانس نے Cocotte کو آئڈیلائز کیا، (اسی طرح) جرمن سامراج نے Valkyrie کو ایک مبالغہ آمیز روپ میں دیکھا۔ یہ دونوں مثالیں ظاہری شکل اور باطنی صداقت کے اختلاف کو نمایاں کرتی ہیں اور ان معاشروں کی تمجید کرتی ہیں جن کا مقدر نا کامی تھی۔ زوال پرستی کا مفہوم یہی ہے۔ ہم اکثر یہ بھول جاتے ہیں کہ زوال پرستی صرف اخراج بشریت، یا بہیمیت کی طرف مراجعت یا صداقت سے فرار کی بنیادوں پر نہیں بلکہ ان سب سے زیادہ ہیر پھر، عدم خلوص اور چاپلوسی کی خصلت سے پہچانی جاتی ہے۔

مکمل تردید کے سوال پر چند اور لفظ کہوں گا۔ میں کسی بھی حالت میں اس خیال کی تشہیر کے حق میں نہیں ہوں کہ ہمیں نفیِ مطلق کی نمائندگی کرنے والی چیزیں خلق کرنی چاہئیں، بلکہ میں تو بیکیٹ یا اس جیسے کسی دوسرے (شخص) کی مطلق اور اخلاقی سلبیت کو اس سطح پر رکھنے کی انتہائی شدید مخالفت کروں گا جو خالص زوال پرستی کی سطح ہے اور جو اس کا راگ الاپتی ہے جو دیوالیا ہے۔ میں یہ قطعاً نہیں کہتا کہ یہ مطلق منفیت غالب فنی میلان بن جائے لیکن میں یہ یقین رکھتا ہوں کہ ہمارے کلچر پر بیکیٹ کے اثر کا انحصار ہم پر، ہمارے رویوں پر اور ہماری تنقیدی فہم پر ہے۔ ہمیں ایسے فنکاروں اور ادیبوں کو جو اخراج بشریت، درندگی، جارحیت، فحاشی اور زوال پرستی کے تمام مظاہر کا گن گاتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ ان لوگوں کو جو ضمیر رکھتے ہوئے بھی بے نیاز رہتے ہیں بیکیٹ جیسے ادیبوں سے الگ کر کے دیکھنے کی عادت ڈالنی چاہیے، جو اس سب کو شدید مایوسی کے عالم میں مسترد کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں ہمیں ان لوگوں کو زوال پرست نہیں سمجھنا چاہیے جو زوال پرستی کو موضوع بناتے ہیں، بلکہ انہیں جو خود کو اس کے مطابق ڈھال لیتے ہیں۔

ژاں پال سارتر:

میں بس دو چار لفظ اور کہوں گا۔ میں اب بھی اس بات پر قائم ہوں کہ زوال پرستی کی خانہ بندی فضول ہے۔ لیکن دوسری اصلاحیں جو یہاں استعمال کی گئیں، مثلاً قنوطیت، اخراج بشریت وغیرہ وغیرہ۔ یہ بہتر ہیں۔ اور مسٹر فشر نے جو کچھ کہا میں اس سے پوری متفق ہوں کہ کیونکہ ابھی ابھی ہم نے یہ وضاحت کی ہے کہ زوال پرستی کا تصور مجموعی طور پر معاشرے سے یکسر الگ اور اس کے سیاق میں بے محل ہے، یہ کہ یہ تصور جس کا اطلاق حلقوں پر بلکہ افراد پر کیا جاتا رہا ہے، معاشرے میں ایک مخصوص اور بحرانی صورت حال کا زائیدہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ہم نے یہ تشریح بھی کی ہے کہ زوال پرستی کو صرف ایک جدلیاتی نقطہ نظر سے ہی دیکھا جاسکتا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر ہم مثال کے طور پر بودلیر کو زوال پرست کہتے ہیں تو یہ اسی کے ساتھ ساتھ مستقبل کے ایک وسیع میدان کا تمہیدی نقطہ بھی ہے، کیونکہ اس کے بعد کی تمام تر شاعری نے اس سے کچھ نہ کچھ اخذ کیا ہے۔

اس اجلاس کو تمام کرنے کی دمہ داری میری نہیں تاہم میں آپ کے سامنے دوبارہ آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے آیا ہوں۔ میں آپ سے یہ کہنا چاہوں گا۔ اور یہ رسمی تشکر کا حصہ نہیں ہے کہ ایک مشرقی (مشرقی یورپی) ملک میں یہ پہلا موقع ہے جب میں نے سوشلسٹوں اور پارٹی

اراکین سے اتنی مفید گفتگو کی ہے۔ یہ ایک ایسا مذاکرہ ہے جس میں نقاط نظر، ایک دوسرے سے اس درجہ قریب ہیں کہ ان میں اگر اختلافات ہیں بھی تو ان پر دلچسپ بحث ہوگی۔ یہ پہلا موقع ہے جب میں نے مارکسز کو ایک نئی زندگی دینے کی تمنا، اس کی نظریاتی توانائی کی بحالی اور اسی کے ساتھ ساتھ مارکسزم کے اساسی اصولوں کی حفاظت کے عزم کا مشاہدہ کیا ہے۔ یہی وہ بات ہے جس نے مجھے حیران کیا، جس نے مجھے اعتماد بخشا، کیونکہ میرے نزدیک ہماری تنہا امید انہیں بحثوں میں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مغرب سے مصالحت ہلاکت آفریں نہ ہوگی کہ اساسی اصول ہمارے لیے بھی اتنے ہی ضروری ہیں جتنے کہ آپ کے لیے، اور یہ کہ یہ بحثیں نتیجہ خیز اسی سبب سے ہیں کہ ہم نے آزادانہ اپنا اظہار کیا۔ اور اسی لیے میں آپ سب کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا۔

○

'شعور' نئی دلّی، مارچ 1979

ایس راما کرشنن

پروف ریڈر کی بیوی

ایک عرصہ ہوا جب اسے مطبوعہ صفحات سے نفرت ہونے لگی تھی۔ وہ اس کے لیے باتھ روم کی دیوار کی دراڑوں میں چھپے کاکروچوں سے بھی زیادہ گھناؤنے ہو گئے تھے۔ کبھی کبھی وہ ان صفحات کو اس وقت تک پھاڑتی رہتی جب تک اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہو جاتا، لیکن صفحات نے کبھی احتجاج نہیں کیا۔ کاکروچ کے برعکس، انھوں نے کبھی منتشر ہونے یا بھاگنے کی کوشش نہیں کی بلکہ خاموشی سے شہید ہوتے رہے۔

جب وہ صفحات چاک کرتی تو سوائے ایک خفیف سرسراہٹ کے انھوں نے کبھی شور نہیں مچایا لیکن وہ اتنا بھی برداشت نہیں کر سکی۔ اب صفحات کو وہ پانی میں بھگو دیتی۔ اس کی دانست میں یہ سب سے بری سزا تھی جو وہ انھیں دے سکتی تھی۔ جب وہ صبح کا کھانا بنانا شروع کرتی تو انھیں لوہے کی بالٹی میں ڈبو دیتی، شام تک وہ گودا بن جاتے۔

جیسے جیسے صفحات گھلتے، چھپے ہوئے الفاظ کہیں غائب ہو جاتے۔ جیسے نمک پانی میں گھل جاتا ہے، کیا وہ بھی ایسے ہی غائب ہو جاتے ہیں؟ وہ غور سے بالٹی کو دیکھتی۔ کبھی کبھی وہ لفظ اور کاغذ کے رشتے کی نوعیت کے بارے میں سوچتی کہ کیا صفحات اس بات پر راضی تھے کہ ان پر لکیریں کھینچی جائیں؟ کیا صفحات اور الفاظ کے درمیان کوئی خلیج بھی ہے؟ جب اس کا دماغ ان خطوط پر سفر کرنے لگتا تو ان فضول خیالات کو ہوا دینے کے لیے اسے خود پر غصہ آتا۔

اس کا گھر مطبوعہ صفحات سے بھرا ہوا تھا۔ سترہ سال کی عمر تک، جب وہ مندر مورتی سے شادی کر کے چنئی آئی تھی، اس نے نصابی کتابوں کے علاوہ کبھی کچھ نہیں دیکھا تھا۔ اس کے گاؤں میں لڑکیوں کے لیے ہائی اسکول نہیں تھا، اس لیے وہ پانچویں جماعت تک ہی پڑھ سکی تھی۔

چھ یا سات سال اس نے مختلف کام کیے مثلاً؛ ماچس پر لیبل لگانا، ربڑ کی گانٹھوں کو توڑنا وغیرہ۔ ماچس کی فیکٹری میں ایک ریڈیو تھا۔ اس پر نشر ہونے والے فلمی نغمے اسے پسند تھے۔ ان دنوں اسے ایک ریڈیو خریدنے کی شدید خواہش تھی جس کے لیے وہ چٹ فنڈ میں شامل ہوگئی، لیکن جب بھی اسے پیسے ملتے وہ دیگر مصارف میں خرچ ہو جاتے۔ چنانچہ شادی کے وقت اس نے ریڈیو لینے کی ضد پکڑ لی، مندر مورتی کو ریڈیو پسند نہیں تھا، اس لیے وہ بند ہی رہتا تھا۔

جب وہ نئی دلہن بن کر چنئی آئی تھی تو مندر مورتی سے خوف زدہ رہتی تھی۔ اس وقت وہ رائل پرنٹنگ پریس میں کام کرتا تھا۔ اس کی جیب میں ہمیشہ ایک پنسل اور ایک صافی ہوتی تھی۔ کبھی کبھی سرخ قلم بھی مل جاتا تھا۔

وہ پروف ریڈنگ کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ مندر مورتی رات کو فرش پر بیٹھا، تکیے پر صفحات رکھے، پنسل سے نشان زد کرتا تو وہ اسے غور سے دیکھتی۔ یوں لگتا جیسے وہ خود سے بات کر رہا ہے، کبھی کبھی وہ اسے زور سے ہنستے ہوئے بھی سن لیتی۔ وہ دیر رات تک پروف ریڈنگ کرتا۔ پھر پچھلا دروازہ کھولتا، پیشاب کرتا اور واپس آ کر لیٹ جاتا۔

جب اس کی انگلیاں اس کے جسم پر گھومتیں، تو خواہ مخواہ اس کے ذہن میں پروف ریڈنگ کا خیال آ جاتا۔ اسے سیکس میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اسے ایک رسم کی طرح ادا کرتا اور انزال کے بعد منھ پھیر کر سو جاتا۔ ان رویوں سے اسے کوفت ہوتی۔ کبھی کبھی سوتے ہوئے بھی اس کی انگلیاں متحرک اور چہرہ مرتکز نظر آتا۔ مندر مورتی زیادہ بات نہیں کرتا۔ وہ صبح چھ بجے سے پروف ریڈنگ کرنے لگتا۔ جب وہ کام پر جانے کے لیے تیار ہوتا تو اپنے لنچ باکس کے ساتھ درست کیے ہوئے صفحات بھی اپنے پیلے رنگ کے تھیلے میں ڈال لیتا۔ اس کا دفتر رویاپیٹہ کے علاقے میں تھا۔ اس کے دوست زیادہ نہیں تھے۔ سیر و تفریح کے لیے وہ کبھی باہر نہیں جاتا۔ اس کی اکلوتی عادت پان چبانے کی تھی، جس کے لیے وہ چمڑے کی ایک چھوٹی تھیلی رکھتا تھا۔ ہر دس منٹ بعد دو ایک پتے نکالتا، ڈنٹھل کو چٹکی سے پکڑتا اور منھ میں رکھ لیتا۔

ایک بار وہ اسے اپنے دفتر کی ایک تقریب میں لے گیا۔ جب اس نے دیکھا کہ ایک بہت بڑی مشین کاغذ کے ڈھیروں کو لپیٹ رہی ہے تو وہ حیران رہ گئی۔ صفحات ایک کے بعد ایک ایسے آ رہے تھے جیسے کوئی پیاز کے چھلکے ادھیڑ رہا ہو۔ 'کاغذ کا پورا رول چھپے گا، اسے پورا پروف ریڈ کرنا

پڑے گا، ہے ناں؟' اس کے اس سوال پر شوہر نے کہا کہ 'بے وقوفی کی باتیں نہ کرو' اور اسے لے کر بائنڈنگ سیکشن میں آ گیا، جہاں اس کی عمر کی چار پانچ عورتیں کاغذ کا ڈھیر لگا کر چپکا رہی تھیں۔ اس نے ان کی تنخواہ کے بارے میں پوچھا۔ سوال کا جواب دینے کے بجائے مندر مورتی نے کہا کہ یہ اس کے لیے مناسب نہیں ہے۔ جب وہ پریس کے آخر میں بنے بیت الخلا کی طرف گئی تو اسے ہر جگہ اوراق بکھرے نظر آئے۔ اسے لگا یہ سارے اس کے گرد گھوم رہے ہیں۔ جنوب کی طرف لوہے کا ایک چھوٹا سا کھلا ہوا دروازہ تھا۔ اس نے اندر جھانک کر دیکھا، وہ بیکار کاغذوں سے بھرا ہوا تھا۔ اسے وحشت ہونے لگی۔ اوراق اس طرح پھڑ پھڑا رہے تھے گویا وہ موسم بہار کے پتے ہوں۔ ان کاغذوں کا کیا ہوگا؟ بیت الخلا جانے کے بعد بھی وہ اس خیال کو جھٹک نہ سکی۔

وہ کبھی سمجھ نہیں پائی کہ مندر مورتی دفتر میں اکیلا پروف ریڈر کیوں ہے۔ ایک دن اس نے وہ صفحات اٹھا لیے جو اس نے درست کیے تھے۔ ہر دوسری لائن میں غلطیاں تھیں، جنھیں دائرہ بنا کر درست کیا گیا تھا۔ جب اس نے صفحات کو دیکھا تو وہ بچوں کے ڈوڈل لگ رہے تھے۔ کبھی کبھی اسے محسوس ہوتا کہ اس کا شوہر تمام ادیبوں سے زیادہ ذہین ہے۔ شاید وہی اسے اچھی طرح سمجھ نہیں پائی۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے کاغذات واپس رکھ دیے اور کھانا بنانے لگی۔

مندر مورتی کی آنکھیں چھوٹی سے چھوٹی غلطی کیسے دیکھ لیتی ہیں؟ کیا اس کا یہ وصف صرف کاغذوں تک محدود ہے، یا اس کی پڑتال کا دائرہ اس تک بھی پھیل گیا؟ ابتدائی دنوں میں، وہ شام کو باہر بیٹھ جاتی اور سڑک کی آمد و رفت دیکھتی رہتی۔ اس نے محسوس کیا کہ گھر آتے ہوئے اس کے چہرے پر خشونت رہتی ہے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی وہ صفحات نکال کر پروف ریڈنگ کرنے بیٹھ جاتا۔ اسے پتہ ہی نہیں چلتا کہ کب اس نے کافی پی اور کب پروسا ہوا ناشتہ ختم ہوا۔ لفظوں میں اس کا استغراق اسے حیران کرتا۔ مندر مورتی کو کھانے کی بھی زیادہ پروا نہیں تھی۔ کبھی کبھی وہ گیلی دھوتی میں ہی کام شروع کر دیتا۔ جب بھی وہ ہچکچاتے ہوئے کوئی دوسرا روزگار تلاش کرنے کی بات کرتی تو وہ جھنجھلاتے ہوئے جواب دیتا کہ اس کام میں کیا برائی ہے؟ وہ کبھی وضاحت نہ کر سکی۔

مندر مورتی ایک دن بھی چھٹی نہیں کرتا۔ جب وہ بیمار ہوتی تب بھی وہ اس کے لیے کھچڑی پکا کر دفتر چلا جاتا۔ وہ دانت پیستی ہوئی بستر پر لیٹ جاتی کہ اس نے ایسے شخص سے شادی ہی کیوں کی؟ وہ بھڑک اٹھتی کہ یہ آدمی ایک حرف کے غلط چھپ جانے سے پریشان ہو اٹھتا ہے، اس کی

دیکھ بھال کرنا بھول کیسے جاتا ہے؟ وہ کبھی اس پر توجہ نہیں دیتا۔ ایک بار چاندنی رات میں اس نے فلم دکھانے کی بات کی۔ وہ جلدی سے ساڑھی بدل کر نکل آئی۔ اس نے دیکھا کہ وہ بل بورڈز اور مونگ پھلی کے لفافے تک کو غور سے دیکھ رہا ہے اور اس میں موجود غلطیوں پر زیر لب بڑبڑا رہا ہے۔

اس نے اسے کبھی سنیما ہال میں ہنستے نہیں سنا۔ اس کا چہرہ ہر وقت سوچ میں ڈوبا رہتا۔ فلم ختم ہونے کے بعد گھر واپس آنے کے لیے بے چین سا رہتا۔ جس رات وہ فلم دیکھ کر آتے اس رات وہ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ وہ اس کی وجہ نہیں سمجھ سکی۔

ان کی شادی کو پندرہ سال سے زیادہ ہو چکے تھے۔ آج تک ان کے ہاں کوئی بچہ نہیں ہوا۔ وہ گھر میں اکیلے رہنے کی عادی ہوگئی۔ کبھی کبھار لیموں لے کر بھگوان دکشنا مورتی کے درشن کے لیے چلی جاتی۔ دیوتا کے سامنے کھڑی ہو کر بھول جاتی کہ کیا دعا مانگنی ہے۔ جب کبھی وہ غصے میں ہوتی تو بھگوان سے کہتی کہ پوری دنیا کو مطبوعہ کاغذات سے پاک کر دے۔ جلد ہی اس کے غصے کی زد میں پنسل، صافی وغیرہ بھی آنے لگے۔

دو برس پہلے، جب اس کے پاس کوئی کام نہیں تھا تو اس نے گھر میں موجود تمام مطبوعہ صفحات ایک ایک کر کے چاک کر دیے۔ شام کو جب مندر مورتی آیا تو دیکھا کہ پورا کمرا پھٹے کاغذوں سے بھرا ہے۔ اس نے ڈانٹتے ہوئے کہا: تھنگمل! اگر تمھیں کاغذ پھاڑنا پسند ہے تو کوڑے دان کے پاس جاؤ، وہاں بہت کچھ ملے گا۔ دوبارہ ایسا مت کرنا۔ وہ سیدھا اپنی میز کی طرف گیا، اوراق اپنے بیگ سے نکالے اور پروف ریڈنگ کرنے لگا۔ وہ زور زور سے رونے لگی۔ ایسا لگا گویا اس نے رونے کی آواز بالکل نہیں سنی۔ اس نے پروف ریڈ کیے ہوئے صفحات اکٹھا کیے۔ وہ اس رات سو نہیں پائی۔ اسے لگا جیسے الفاظ صفحات سے گر کر اس کے بازوؤں، ٹانگوں اور پورے جسم پر چپک گئے ہیں۔

مندر مورتی فوراً اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ اس نے متوحش نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور کہا کہ میں ڈر گئی تھی۔ ڈاکٹر نے ایک ہفتے تک خواب آور دوا کھانے کی صلاح دی۔ جب وہ سوتی تو اس کی آنکھیں مضبوطی سے بند ہوتیں۔ وہ بے ہوشی کے عالم میں بھی اسے پروف ریڈنگ کرتے دیکھتی۔ وہ کھل کر رو نہیں سکتی تھی اس لیے سو جاتی۔

ایک سال تک اسے ہر ہفتے جنرل ہسپتال جانا پڑا۔ وہ سڑکوں پر خاموشی سے چلتے۔ ہسپتال پہنچنے تک دونوں میں سے کوئی ایک لفظ نہیں بولتا۔ وہ جب اسے OPD میں بٹھاتا تو وہ مخالف سمت میں لگے شیرش کے درخت دیکھتی رہتی۔

جیسے ہی وہ سفید اور زرد رنگ کی گولیاں لے کر گھر لوٹتے، وہ پریس کے لیے روانہ ہوجاتا۔ گولیوں پر بھی الفاظ چھپے ہوتے تھے، وہ یہ جاننے کے لیے انھیں غور سے دیکھتا کہ آیا وہ درست ہیں یا نہیں۔ اسی کے ساتھ اس کے ذہن کے پردے پر ایک خیال تیر گیا کہ جیسے گولیاں پیٹ میں گھل جاتی ہیں، کیا الفاظ بھی گھل جائیں گے؟ وہ آنکھیں بند کر کے گولی نگل جاتی۔

کاغذ نے بھی اس کی نفرت اور غصے میں اضافہ کیا۔ وہ دنیا کے تمام مطبوعہ صفحات مٹانے کے جنون میں مبتلا ہوگئی۔ اس نے اس سے بات کرنا چھوڑ دیا۔ وہ جب پانی مانگتا تو وہ صرف اس کی طرف دیکھتی رہتی، گویا اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔ وہ خود اٹھتا اور پانی پیتا۔

رات کو وہ دیکھتا کہ وہ چٹائی پر بیٹھی ہے، اس کا ابھی سونے کا ارادہ نہیں ہے تب بھی وہ کام کرنا بند نہیں کرتا۔ ایک دن وہ اس کے پیچھے کھڑی اسے کام کرتا دیکھ رہی تھی۔ جس طرح ایک خونخوار درندہ اپنے شکار کو مارتا ہے اسی طرح وہ اپنی پنسل سے الفاظ کی تصحیح کر رہا تھا۔

اس نے بڑھ کر پوچھا کیا اس کاغذ کے باہر بھی یہاں کچھ ہے؟ اِدھر اُدھر دیکھے بغیر اس نے کہا، مجھے نہیں معلوم۔ جب اس نے کاغذات کو غور سے دیکھا تو اسے الفاظ بکھرتے، ٹوٹتے اور رقص کرتے نظر آئے۔ اچانک وہ اسے گلے لگا کر رونے لگی۔ اس کے ہاتھ سے پنسل زمین پر گر گئی اور اس کی نوک ٹوٹ گئی۔ اس نے اسے اپنی بانہوں سے الگ کیا، پنسل اٹھائی اور احتیاط سے اس کی نوک بنانے لگا۔ اس کے سامنے ایک ہزار صفحے کا ناول پروف ریڈنگ کا منتظر تھا۔ پورا کمرا تھنگمل کی سسکیوں سے بھر گیا۔

(تمل کہانی کا انگریزی سے ترجمہ: عبدالسمیع)

باما

(تمل کہانی)

تصفیہ

تیسری، چوتھی اور پانچویں جماعت کے بچے بہت پر جوش تھے۔ صرف انھیں ہی قریبی شہر کے ایک سنیما ہال میں فلم دکھانے کے لیے چنا گیا تھا۔ وہ اتنے خوش تھے کہ اپنی پڑھائی پر توجہ نہیں دے پا رہے تھے۔ وہ تو اسی انتظار میں تھے کہ کل کب آئے گا۔ ہیڈ ماسٹر نے اعلان کیا کہ ہر ایک طالب علم اپنے ساتھ پانچ روپے لائے گا۔ اس کے علاوہ انھوں نے مزید ہدایات دیں، مثلاً؛ سب کو یونیفارم میں آنا ہے، جن کے پاس چپل ہو وہ پہن کر آئے، جن کے پاس پانی کی بوتلیں ہوں وہ اپنے ساتھ پانی لے کر آئے وغیرہ وغیرہ۔ بچے جوش سے بھرے ہوئے تھے اور کیوں نہ ہوتے؟ وہ تو یہی سمجھ رہے تھے کہ وہ شہر کی سیر پر نکلنے والے ہیں۔

کاٹور پرائمری اسکول کو وجود میں آئے پچاس سال گزر چکے ہیں، لیکن گاؤں میں کسی قسم کی ترقی کا کوئی نشان نظر نہیں آتا۔ نہ بس، نہ پانی، نہ ہسپتال کی سہولت، کچھ بھی نہیں۔ چائے اور کریانے کی دکان تو کجا پیاس بجھانے کے لیے سوڈے۔ تاڑی کی ایک چھوٹی سی دکان تک نہیں ہے۔ معمولی سے معمولی ضرورت کی چیز کے لیے تین کلو میٹر دور اتھوکوٹائی جانا پڑتا ہے جو نسبتاً بڑا شہر ہے، جہاں سے ہر قسم کی چیزیں خریدی جاسکتی ہیں۔ یہاں ایک نہیں دو۔ دو سنیما ہال ہیں۔ انھی میں سے ایک سنیما ہال میں طلبا کو بچوں کی فلم دیکھنے جانا ہے۔ انھیں اس سے غرض نہیں کہ کون سی فلم ہے؛ ان کے خوش ہونے کے لیے اتھوکوٹائی جانے کا خیال ہی کافی تھا۔

اگلے دن خلاف معمول سات بجے ہی سب اسکول آگئے۔ اسمبلی کے بعد، انھیں ایک قطار میں کھڑا کیا گیا اور دونوں سرے پر اساتذہ کھڑے ہو گئے۔ ہیڈ ماسٹر اپنی گاڑی سے آگے نکل گئے۔ خوشی اور جوش سے معمور بچے تیزی سے چل پڑے۔ انھیں کم و بیش تین کلو میٹر پیدل چلنا تھا۔ آدھا

راستہ دوڑتے اور آدھا راستہ چلتے ہوئے، وہ منزل مقصود پر پہنچے۔ تھیٹر میں کسی دوسرے اسکول کے بچے پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک ایک گن کر انھوں نے ہمارے بچوں کو اندر جانے دیا۔ تھیٹر کے اندر ایسا ہنگامہ تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ جب تمام بچے بیٹھ گئے تو فلم شروع ہوئی، یہ کوئی دس کے بعد کا وقت تھا۔ اسکریننگ شروع ہوتے ہی خاموشی چھا گئی۔ 'پیپرز ڈے آؤٹ'، گو کہ انگریزی فلم تھی، لیکن بچوں نے فلم کا بھرپور لطف اٹھایا۔ انھوں نے چھوٹے بچے کے کردار کے ساتھ خود کو آہنگ کر لیا تھا۔ وقفے کے دوران، انھوں نے کھانے کے لیے کئی چیزیں خرید لیں، جب تک ان کے پاس پیسے رہے جو بھی نظروں میں بھایا خرید لیا۔

فلم ختم ہونے کے بعد، بچے دوبارہ ایک قطار میں کھڑے ہو گئے اور ناقابل برداشت گرمی میں کسی طرح واپس چل پڑے۔ جب وہ مین روڈ عبور کر رہے تھے تو لائن ٹوٹ گئی۔ دوپہر کی تپتی گرمی میں ان کے پاؤں جل رہے تھے۔ بہت سے بچوں کے پاس چپل نہیں تھی۔ زبانیں پیاس کی شدت سے تالو سے لگ گئی تھیں۔ بچوں نے تھیٹر میں ہی اپنا پانی ختم کر لیا تھا۔ اب وہ پسینے میں شرابور واپس اسکول پہنچنے کے لیے بے تاب تھے کہ وہ وہاں پانی پی سکیں گے۔

واپسی کے راستے میں صرف ایک کلومیٹر کے فاصلے پر پلاتھور نام کا ایک گاؤں ہے۔ وہ اتنے پیاسے تھے کہ جیسے ہی پاس پہنچے، تمام بچوں نے گلی کے ہینڈ پمپ سے پانی نکال کر پینا شروع کر دیا۔ پانچویں کلاس کے ایک بڑے لڑکے نے ان سب کے لیے ہینڈ پمپ سے پانی نکالا۔ پانی پینے کے لیے بھیڑ لگ گئی اور وہ ایک دوسرے کو دھکا دیتے پانی تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگے۔ انھیں قطار میں کھڑے ہو کر پانی پینے پر آمادہ کرنا ایک دشوار کن مرحلہ تھا۔ تیسری جماعت کی طالبہ مگالکشمی بڑی مشکل سے اپنی بوتل بھر سکی لیکن پانچویں جماعت میں پڑھنے والی اس کی بہن وجے لکشمی نے اسے پینے نہیں دیا۔ اس نے بوتل چھین لی، اس کی پیٹھ پر زور سے مکا مارا اور بوتل کا پانی زمین پر انڈیلتے ہوئے غصے سے بولی: ''تم دلت محلے میں لگے ہینڈ پمپ کا پانی پینے جا رہی ہو؟ ہاں؟ ٹھہرو!... اپا کو بتاتی ہوں۔ وہ زور کا تھپڑ ماریں گے۔'' مجھے بہت زور کی پیاس لگی ہے؛ پلیز اپا کو مت بتانا، اکا۔ میں بس تھوڑا سا پیوں گی۔'' مگالکشمی گڑگڑائی۔

وجے لکشمی نے اسے پانی پینے نہیں دیا۔ مگالکشمی زور زور سے رونے لگی؛ اس کے رونے کی آواز سن کر میری میڈم نے پوچھا، مگالکشمی! تم کیوں رو رہی ہو، چل نہیں سکتی؟ اب تو اسکول پاس

ہی ہے۔ دیکھو، وہ رہا ہمارا اسکول ہے..... ہم تو کلاس بھی دیکھ سکتے ہیں۔''

شانتی، جو ساتھ چل رہی تھی بولی، 'نہیں میم! مگا کو پیاس لگی ہے۔ اس لیے وہ رو رہی ہے۔'

میڈم نے جواب دیا، 'ابھی تو سب نے پمپ سے پانی پیا ہے، اتنی جلدی آپ کو پیاس کیسے لگ گئی؟ ٹھیک ہے، چلو، کوئی بات نہیں، اسکول میں پیتے ہیں۔'

'اس نے پمپ سے پانی نہیں پیا، میم! اس کی بہن نے کہا کہ یہاں کا پانی مت پیو اور وہ اسے گھسیٹ کر لے گئی۔'

'اس نے اسے پانی پینے سے کیوں روکا؟'

'یہ ایک دلت پمپ ہے، میم۔ اگر وہ اس کا پانی پی لیں گی تو ان کے اپّا (والد) انھیں ماریں گے۔'

'یہ کس نے کہا؟'

'مگا لکشمی کی اکّا (بہن) نے، میم!

میری میڈم سن رہ گئیں۔ اتنی چھوٹی عمر میں ہی وہ اس بھید بھاؤ سے باخبر ہے۔... غصے اور درد سے ان کا دل بھر گیا... وہ سب کلاس میں اکٹھا رہتے ہیں... ایک دوسرے سے گھل مل جاتے ہیں... اس سکول میں سب ایک ہی نل سے پانی پیتے ہیں... یہ دلت پمپ کیا ہے جس کے بارے میں وہ ابھی بات کر رہی ہے.. ایسے قبیح اور بھدے خیالات ان کے ذہن اور لاشعور میں کیسے داخل ہو گئے.... اس کا باپ اسے مارے گا، اس کا مطلب تو یہی ہوا کہ یہ سب انھوں نے اپنے گھر میں سیکھا ہے... دماغ میں کئی طرح کے خیالات آنے لگے، میری میڈم کچھ کہے بغیر آگے بڑھ گئیں۔

تھوڑی دیر بعد انھوں نے وجے لکشمی کو بلایا اور اس سے پوچھا: وجے لکشمی، اگر تم اس پمپ سے پانی پیو گی تو کیا ہو گا؟ اس سے تو صاف پانی ہی نکلتا ہے، ہے نا؟ مجھے لگتا ہے تم نے اسے پانی پینے سے منع کیا ہے؟

''جی میم! ہمیں گھر میں یہی بتایا گیا ہے، دلت بچوں کے ساتھ مت گھلنا۔ وہ کچھ دیں تو مت کھانا اور دلت محلے کے قریب مت جانا۔

''تم اس طرح کا برتاؤ کیسے کر سکتی ہو؟ یہ غلط ہے، ہے نا؟'' ٹیچر نے کہا۔ وجے لکشمی کچھ بولے بغیر آگے بڑھ گئی۔ اس کے بعد میڈم نے بھی کچھ نہیں پوچھا۔

بھوک اور گرمی سے تھکے ماندے بچے جلدی جلدی اسکول کی طرف چلنے لگے۔ اساتذہ کے قدم بھی تیز ہو گئے۔

میری میڈم اس گفتگو سے بہت پریشان ہوئیں۔ میں نے انھیں سکھایا تھا کہ ذات پات کچھ نہیں ہے، بچو!، اعلیٰ ذات یا ادنیٰ ذات کہنا بھی گناہ ہے۔ یہ سب بکواس ہے۔ وجے لکشمی پچھلے سال چوتھی جماعت میں میری طالبہ تھی۔ مجھے یاد ہے کہ تامل نصاب میں شامل بھرتیار کی نظم 'مورسو' کی تشریح کس طرح کی تھی... کیسے انھیں بلی کے بچے کی مثال دیتے ہوئے اپنا گلا خشک ہونے تک بتایا تھا کہ سبھی انسان برابر ہیں... وہ سب فضول تھا.... اس کا کوئی فائدہ نہیں... اسکول میں سکھائی گئی باتوں کے مقابلے گھر میں سکھائی جانے والی چیزوں کو بچہ جلد سیکھ لیتا ہے۔... کیا فائدہ.... ہیڈ ماسٹر کے آتے ہی ان سے کہوں گی کہ اس طالبہ سے باز پرس کریں... میری میڈم نے دوپہر کا کھانا بے دلی سے کھایا اور ہیڈ ماسٹر کا انتظار کرنے لگی۔

دوپہر کا کھانا گھر پر کھانے کے بعد ہیڈ ماسٹر دو بجے کے قریب اسکول آئے۔ ٹیچر نے دھیمے لہجے میں کہنا شروع کیا، 'سار!.... واپسی میں بچوں کو بہت پریشانی ہوئی، سار! گرمی نے انھیں نڈھال کر دیا... اچھی بات یہ ہوئی کہ ہم پلاتھور آ گئے .... وہاں پانی پینے کے بعد ہی بچے تھوڑی تیز رفتاری سے چل سکے، سار! لیکن اس گرمی اور پیاس میں بھی کچھ بچوں نے وہاں کے پمپ سے پانی نہیں پیا۔

'کیا.... کیوں، کیا ہوا؟'

میری میڈم نے راستے کی روداد تفصیل سے بتائی اور آخر میں کہا کہ اس طالبہ سے باز پرس ہونی چاہیے۔ انھوں نے فوراً ایک بچے کو دونوں بہنوں کو بلانے کے لیے بھیجا۔

دونوں بچیوں کے آنے کے بعد ہیڈ ماسٹر نے رسان سے کہا: 'محلے کے پمپ سے پانی پینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہ تو صرف ان کے گھروں کے بارے میں ہے کہ آپ کو وہاں سے پانی نہیں پینا چاہیے۔ کیا آپ کے گھر کے بڑوں نے آپ سے کہا تھا کہ محلے کے اس پمپ سے بھی پانی نہیں پینا؟ ٹھیک ہے، اچھا، کلاس میں جائیے۔ ''صرف ان کے گھروں'' کے فقرے پر زور دیتے ہوئے ہیڈ ماسٹر وردارا جلو کلاس میں چلے گئے۔

(تمل کہانی کا انگریزی سے ترجمہ: عبدالسمیع)

ایسابیل الینڈے

پالا

ہم کامل بن کر رہنے کے لیے نہیں آئے ہیں
ہم کھونے آئے ہیں جیسے درخت پتے کھوتا ہے
وہ درخت جو ٹوٹ گئے ہیں
اب پھر سے اُگے گیں، مضبوط جڑوں کے ساتھ

(روبرٹ بلائی)

دسمبر 1991 کی بات ہے جب میری بیٹی ''پالا'' سخت بیمار ہوئی، بیمار اس قدر کہ وہ کوما میں چلی گئی۔ وہ میڈریڈ اسپتال میں زیرِ علاج رہی تو میں وہاں اُس کے ساتھ تھی۔ کچھ مہینے ہوٹل میں گزارے تو میں اُس کے ساتھ تھی اور کلی فورنیا میں ہمارے اپنے مکان میں سال 1992 کے موسمِ گرما اور سال ختم ہونے تک جب وہ بیڈ پر تھی تو میں پھر سے اُس کے ساتھ تھی۔ ناول کے یہ صفحات پالا کے ساتھ گزارے گئے اِسی وقت کے دوران رقم ہوئے ہیں۔

(ایسابیل الینڈے)

حصہ اوّل

دسمبر 1991 تا مئی 1992

.....

پیاری پالا، سنو!

میں تمہیں ہمارے خاندان کی ایک کہانی سناؤں گی تا کہ جب تم نیند سے بیدار ہو تو تم خود کو شکست خوردہ نہ پاؤ۔ ہمارے خاندان کی یہ کہانی گذشتہ صدی کے آخر میں اُس وقت شروع ہوئی جب باسکیوز کے ایک صحت مند ملاح نے چلی کے ساحل پر قدم رکھا۔ اپنی ماں کا دیا ہوا مقدس دھاگا اپنی گردن میں لٹکائے اُس کا سر نشانِ عظمت لگ رہا تھا۔

لیکن تمہیں یہ کہانی سنانے کے لیے اتنا پیچھے کیوں جایا جائے؟ بس اتنا بتا دینا کافی ہے کہ اُس ملاح کے بعد ہمارے خاندان کی جو بھی نسل بنی وہ بہادر عورتوں اور انتہائی حساس اور مضبوط جسم والے لوگوں کی نسل تھی، جو کوئی بھی محنت والا کام کر سکتے تھے۔ اُسی دور میں ایک وبا پھیلی جس نے اِس نسل کے کئی لوگوں کو لقمۂ اجل بنا لیا۔ وبا کی وجہ معلوم نہیں ہوئی پر جو لوگ مرے، وہ مزاجاً غصیلے قسم کے تھے اور مرنے سے قبل اُن کے منہ میں ایک جھاگ سی بنی تھی۔

باسکیوز کے ہمارے خاندان والوں نے دارالحکومت کے مضافات میں ہی زرخیز زمینیں خریدی جن کی قیمت وقت کے ساتھ بڑھ گئی تھی۔ اِن زمینوں پر ان لوگوں نے بعد میں بڑی بڑی خدائی عمارات، پارک اور چھوٹے باغیچے بنوائے۔ ہمارے خاندان نے اپنی لڑکیوں کی شادی امیر اور مضبوط گھرانوں کے جوان لڑکوں سے کیں، اور جو اولاد بعد میں ہوئیں اُنھیں معیاری مذہبی اسکولوں میں پڑھایا گیا تھا جہاں سے اُن کی اچھی تربیت ہوئی اور وہ حکمران بنے اور ایک سے زائد صدی تک حکومت کرتے رہے۔ یہ حکومت تب تک جاری رہی جب تک نہ تاجروں اور ٹیکنو کریٹس نے باقاعدہ طور پر زمام کار اپنے ہاتھ میں لی۔

میرے دادا کا تعلق ایک شریف خاندان سے تھا۔ دادا کے والد ایک رات گولی کا شکار ہو گئے اور زخموں کی تاب نہ لا کر انتقال کر گئے تھے۔ اُس رات وہ کیسے مرے، یہ راز کبھی پتہ نہ چل سکا۔ پر شاید وجہ کوئی بدلے کی آگ تھی یا محبت سے جڑا کوئی معاملہ۔ اِس حادثے سے دادا کا گھر سخت متاثر ہوا کیونکہ میرے پردادا سب سے بڑے تھے۔ پردادا کے جانے کے بعد گھر کی ساری ذمہ داری کا بھوج میرے دادا کے کندھوں پر آ گیا۔ اس لیے انھوں نے اپنی اسکولی تعلیم چھوڑ دی اور گھر کے اخراجات پورا کرنے اور چھوٹے بھائیوں کی تعلیم کا بندوبست کرنے میں وہ اپنی والدہ کا ہاتھ بٹانے لگے۔

میرے دادا نے بہت محنت کی اور ایک وقت آیا کہ وہ امیر ہوئے اور اُن کو معاشرے

میں عزت و توقیر ملی۔ وہ امیر ضرور ہوئے پر اُنھیں غربت کا اصل مفہوم معلوم تھا۔ اُن کے مطابق اگر آپ معاشرے میں ایک مقام پر ہونے کے باجود غریب ہیں تو یہ بہت اذیت ناک ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ غریبی کو ختم کیا جائے۔

میرے دادا اپنے والد کے کپڑے جب بھی استعمال کرتے تو ہمیشہ مزیّن اور ممتاز نظر آتے تھے۔ کھڑے کالر اور پریس کی ہوئی مزیّن شرٹ میں وہ اچھے دکھتے تھے۔ وہ جب غریبی کے ایام گزار رہے تھے تو اُن کے مزاج میں غصہ تھا۔ کیونکہ وہ زندگی اُن کے لیے مصائب اور مشکلات سے بھری تھی۔ خود کو غریبی سے نکالنے کے لیے انھوں نے سخت محنت کی اور اُن کا ماننا تھا کہ ایک عزت دار شخص کو اس دنیا سے تب تک نہیں جانا چاہیے جب تک نہ وہ اپنے کسی غریب پڑوسی کی مدد کرے۔

وہ ابھی جوان ہی تھے کہ محنت اور لگن اُن کی شخصیت کا خاصہ بن گئی تھیں۔ یہ سب خاصیتیں شاید اُنھیں اپنے اجداد سے ملی تھیں اور اپنے اجداد کے خصائص کے عین مطابق وہ تفاخر میں نہیں بلکہ ایک عاجزانہ زندگی گزار رہے تھے۔ اُن کی روح میں بھی ایک عجب کشش تھی۔ وہ شاید اپنی زندگی کے کچھ خواب رکھتے تھے جنھیں وہ پورا کرنا چاہتے تھے..... اور اسی عالم میں وہ میری دادی کی محبت میں گرفتار ہوئے تھے، جو اپنے ۱۲/افراد والے خاندان میں سب سے چھوٹی تھی۔ اِس خاندان کے افراد عجیب العادات کے مالک تھے..... جیسے ٹریسا، جس نے اپنی عمر کے آخری حصے میں فقیرانہ زندگی اختیار کی اور پارکیو جے پونس میں جس کی موت کے موقعے پر گلاب کے سب پھول راتوں رات مرجھا گئے تھے۔ یا امبریوسو جیسے، جو ایک شرابی اور زانی تھا اور جو اِس بات کے لیے بھی مشہور تھا کہ وہ کھلی سڑک پر اپنے کپڑے نکال کر غریب کو دیتا تھا۔

میں بڑی ہو رہی تھی تو دادی اماں کے متعلق طرح طرح کی کہانیاں مجھے سننے کا موقع ملا۔ میں نے سُنا کہ وہ مستقبل بتا سکتی تھی، دماغ پڑھ سکتی تھی، جانوروں سے بات کر سکتی تھی اور اپنی نگاہوں کی کشش سے وہ چیزوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر سکتی تھی۔ مشہور تھا کہ دادی نے ایک روز کمرے میں ایک میز کو چلایا تھا۔ لیکن میں نے خود سے جو چیز دیکھی وہ یہ تھی کہ ایک روز چائے کے وقت اُنھوں نے شکر کے ایک کٹورے کو ٹیبل پر نچایا تھا، جو چائے کے وقت وہاں پر موجود رہتا تھا۔ ان سب کاموں نے دادی کو ایک عجیب المخلوق بنایا تھا اور لوگ اُن سے کچھ خائف رہتے تھے۔ میرے دادا جادو اور دماغ پڑھنے اور دماغ سے چیزوں کو حرکت دینے کے اِس علم کو

مثبت انداز میں دیکھتے تھے اور اِسے دادی سے شادی کے لیے کوئی رُکاوٹ نہیں سمجھتے تھے۔ ہاں، جس چیز کو لے کر دادا کو فکر تھی، وہ اُن کا اور دادی کی عمر کے درمیان کا فرق تھا۔ میری دادی دادا سے عمر میں بہت چھوٹی تھی اور جب وہ اُن سے پہلی بار ملے تھے تو دادی تب گڑیوں سے کھیلنے والی بچی تھی جو اپنے چھوٹے اور میلے سرہانے کے ساتھ چمٹتی رہتی تھی۔

دادی جب بچی تھی تو دادا اُنھیں بچی کے طور پر ہی دیکھتے تھے اور اُن کے دل میں محبت والے کوئی جذبات نہیں تھے۔ لیکن ایک دن دادا نے دادی کو کھلے بال اور ایک لمبے لباس میں دیکھا تو اُن کے دل میں دادی کے لیے محبت کے جذبات پیدا ہوئے۔ دادا اِن جذبات کو سنبھال بھی نہیں پائے اور شرم سے پانی پانی ہو گئے اور دادی سے ہو رہی گفتگو کو وہ جاری نہ رکھ سکے۔ دادی نے دادا کی وہ حالت بھانپ لی تھی۔

کچھ وقت کے بعد جب دادا کچھ سنبھلے تو اُنھوں نے دادی کے نام محبت کا پہلا خط لکھا تھا۔ خط میں دادا نے بنا کوئی گول مول بات لکھے دادی سے براہِ راست پوچھ لیا کہ وہ اُن سے کب شادی کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ اِس کے کچھ ہی ماہ بعد دونوں کی شادی ہو گئی۔ شادی کے دن دادی کی خوبصورتی کی انتہا نہیں تھی جسے دیکھ دادا ششدر رہ گئے تھے اور اُنھیں معلوم تھا کہ اپنی زندگی کے آخری ایام تک وہ دادی سے بے انتہا محبت کرتے رہیں گے۔

میرے لیے وہ ہمیشہ ٹاٹا اور میمے کی طرح تھے۔ میں تم کو اِن کی اولاد میں سے صرف میری والدہ کی کہانی سناؤں گی، کیونکہ اگر میں نے سبھی اولادوں کی کہانیاں بتانا شروع کی تو یہ کام کبھی ختم نہیں ہوگا، اور اب تو اُن میں سے اکثر ہم سے بہت دور رہتے ہیں۔ دادا اور دادی کی سبھی اولادیں ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ اُن کا ایک دوسرے کے ساتھ رہنا مشکل لگ رہا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ الگ ہو گئے تھے۔

میری ماں دو عالمی جنگوں کے درمیان، سال 1920 کے موسمِ بہار کے ایک حسین دن پیدا ہوئی تھی۔ وہ ایک حساس لڑکی تھی جو اپنے بھائیوں کے ساتھ کھیلنے میں دوری اختیار کرتی تھی۔ چوہے پکڑنے کے اُس کھیل میں وہ کبھی شریک نہ ہوئی جو اُس کے بھائی اکثر کھیلا کرتے تھے۔ وہ تنہا پسند تھی اور زیادہ وقت اپنے گھر کی چار دیواری کے اندر ہی بسر کرنا پسند کرتی تھی۔ وہ خود کو خوش رکھنے کے لیے خیرات بھی کرتی تھی۔ وہ رومانی ناول پڑھنے کا شوق رکھتی تھی اور اُسے اپنے خاندان کی سب سے خوصورت عورت ہونے کا اعزاز بھی حاصل تھا۔

بالغ ہونے کے وقت سے ہی اُس کے چاہنے والے مکھیوں کی طرح اُس کے اردگرد گھومتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کے والد مردوں سے اُس کو دور رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ مردوں کے یہ حربے بالآخر تب ختم ہوئے جب ایک نوجوان نے میری ماں کا دل اور جذبات دونوں جیت لیے۔

وہ تمہارے دادا تھامس تھے جو ایک دھند میں غائب ہو گئے تھے..... اور پالا، میں نے تمہارے دادا کا ذکر صرف اس لیے کیا کیونکہ اُن کا کچھ خون تمہاری رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ وہ انتہائی چالاک، تند ذہن، صاف گو، تعصّبات سے پاک اور سب سے الگ اور جُدا تھے..... وہ اپنے وقت کے سانٹیاگو تھا۔

مشہور تھا کہ تمہارے دادا کا ماضی اچھا نہیں تھا۔ یہ بھی افواہ تھی کہ وہ میسونک فرقے سے تعلق رکھتا تھا، اس لیے اُنھیں گرجے کا دشمن سمجھا جاتا تھا۔ اور یہ کہ اُس کا ایک ناجائز بیٹا ہے جو کہیں چھپا ہے۔ لیکن ٹاٹا کے پاس اِن افواہوں کو سچ ثابت کرنے کے لیے کوئی ثبوت نہیں تھا جس سے اُس کی بیٹی اپنے ہونے والے شوہر سے متنفر ہو جاتی۔ اور میرے دادا کسی کی عزت یوں اچھال نہیں سکتے تھے کیونکہ یہ اُن کے اصولوں کے خلاف تھا۔

اُن دنوں میں چلی ایک پیسٹری کی پرتوں جیسا کئی حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ چلی میں ہندوستان سے بھی کئی زیادہ ذاتیں تھی اور ہر ذات کے لیے کوئی خاص اصطلاح تھی جو اُنھیں اپنے صحیح مقام کا احساس دلاتی تھی، جیسے: روٹو، پی جے، اری بستا، سیوٹیکو اور ایسی ہی دوسری اصطلاحیں ..... یہ ذاتیں ہم خیال اور یک جا تھے اور اور بعض عمدہ خیالات کے تحت کام کرتے تھے۔

پیدائشی برتری سب کو حاصل تھی۔ اور سب کو سماج میں ایک دوسرے سے اختلاف کا حق حاصل تھا۔ لیکن کئی نسلوں سے رواج تھا کہ پیسہ، شہرت اور ہُنر کی بنیاد پر ایک شخص آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ تھامس کا عزت دار نسب اُس کی خاصیت تھی حتیٰ کہ ٹاٹا اُس کے سیاسی ناطوں کو شک کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اُس دور تک چلی کی سوشلسٹ جماعت کے بانی سیل ونڈر الینڈے سے نجی ملکیت، قدامت پسند اخلاقیات اور بڑے زمین داروں کی طاقت کے بارے میں تفتیش ہونے لگی۔ تھامس اُس نوجوان ڈیپوٹی کا کزن تھا۔

(مترجم: احمد توصیف قُدس)

○

قاضی جاوید

ایرک فرام اور انسانی ذات کا ارتقا

اب تک کی انسانی تاریخ میں اتھارٹی ہمیشہ واضح اور ٹھوس صورت میں موجود رہی ہے۔ انسان کو معلوم رہا ہے کہ اس نے کسی کے احکامات کی تکمیل کرنی ہے۔ مثلاً باپ، بادشاہ، استاد، آقا، خدا اور مذہبی رہنما وغیرہ۔ بلاشبہ ادوارِ گذشتہ میں بھی ہر قسم کی اتھارٹی کو چیلنج کیا جاتا رہا ہے۔ مگر خود اتھارٹی کا وجود مشتبہ نہیں رہا۔ تاہم صدی رواں کے وسط میں اتھارٹی کی ماہیت بنیادی تغیر سے گزری ہے۔ اب وہ پہلے کی طرح واضح اور ٹھوس نہیں رہی بلکہ تجریدی اور برگشتہ اتھارٹی بن گئی ہے۔ اس اتھارٹی کو چھوا جا سکتا ہے اور نہ ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ اب تار بنانے والا نظر نہیں آتا۔ مگر المیہ یہ ہے کہ ہر کوئی اس کی طرف کھنچا چلا جا رہا ہے۔ یہ تار ہلانے والا کون ہے؟ یہ منافع ہے۔ معاشی ضروریات ہیں۔ منڈی ہے۔ فہم عامہ ہے۔ رائے عامہ ہے۔ یہ ہیں نئے انسان کے نئے آقا، یہ کھل کر سامنے آتے ہیں اور نہ ہی ان کے خلاف بغاوت کا جذبہ پروان چڑھتا ہے۔ انسانی شخصیت ان غیر محسوس دیوتاؤں کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر اپنے تخلیقی امکانات کی تکمیل کے محرکات سے محروم ہوگئی ہے۔ نئے آقا انسان کو ہجوم میں گم ہونے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ انفرادیت جیسی کوئی شئے باقی نہیں رہی۔ حالانکہ گذشتہ صدی کے بورژوا اس کا چرچا کرتے نہ تھکتے تھے۔ انفرادیت کا خاتمہ تو ناگزیر تھا کہ برگشتہ انسان کسی طور پر اپنا سامنا نہیں کر سکتا کہ اس قسم کی دہشت برداشت کرنا اس کے بس کا روگ نہیں۔

تجریدی اتھارٹی اور اس کی خودکارانہ اطاعت اصل میں بڑی حد تک سُپر کیپٹیلزم کے اندازِ پیداوار سے پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ پیداوار کا جدید انداز مشین سے فوری مطابقت، منظم اجتماعی رویہ، اجتماعی ذوق اور بلاتشدد اطاعت کا طلب گار ہے۔ ایرک فرام نے اس معاشی نظام کے ایک ناگزیر نتیجہ کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اس کا تعلق اشیا کے وسیع پیمانے پر استعمال سے ہے۔ جدید

معاشی نظام کی اس ضرورت نے نئے انسان کی شخصیت کو اس طرح ڈھال دیا ہے کہ اب وہ اپنی کسی خواہش کی عدم تکمیل کو گناہِ کبیرہ خیال کرنے لگا ہے۔ اس کا رہنما اصول یہ ہے کہ کوئی خواہش نہیں دبانی چاہیے۔ ہر خواہش کی فوری تکمیل ہونی چاہیے۔

ہر خواہش کی فوری تسکین کے اصول نے سپر کیپٹیلزم میں انسان کے جنسی رویوں کو بھی متاثر کیا ہے۔ عموماً اس کا جواز فرائڈ کے فکری نظام کی عامیانہ توضیحات سے حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ خیال عام ہے کہ اگر کوئی جنسی خواہش دبائی گئی تو بہت سی نفسیاتی بیماریوں کا دروازہ کھل جائے گا۔ ان سے محفوظ رہنے کے لئے ضروری ہے کہ کسی جنسی خواہش کو تشنۂ تکمیل نہ رہنے دیا جائے۔ ایرک فرام کے نزدیک اس رویّے سے وہی نتیجہ پیدا ہوتا ہے جو تجریدی اتھارٹی کی اطاعت سے پیدا ہوا ہے یعنی انسان کی ذات اپاہج ہو کر بالآخر فنا ہو گئی ہے۔ انسانی شخصیت کو نکھارنے کے لیے بہت سی خواہشات پر غالب آنا ضروری ہوتا ہے۔ خصوصاً بیمار معاشرے میں ایسی خواہشات کی تعداد خوفناک حد تک بڑھ جاتی ہے۔ ان مصنوعی خواہشات کی تسکین کے چکر میں گرفتار ہو کر انسان غیر حقیقی مسرت اور ہوس کا پجاری بن جاتا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ خواہشات کی فوری تسکین کی خاطر زیادہ سے زیادہ محنت کرتا ہے۔ فی الواقعہ یہ خواہشات معاشی نظام کی ہی پیداوار ہوتی ہیں۔ یوں روح اور جسم دونوں اعتبار سے انسان معاشی نظام کے جبر کا شکار ہو جاتا ہے۔

اس انسان دشمن نظام نے انسان کی ذہنی صلاحیتوں کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ نئے انسان نے فہم و دانش اور ضمیر کے میدان میں پیش قدمی کی ہے۔ مگر یہ محض خوش فہمی ہے۔ بجا طور پر ایرک فرام ہماری توجہ اس امر کی طرف دلاتا ہے کہ جدید انسان ذہانت کے اعتبار سے آگے بڑھا ہے۔ البتہ جہاں تک فہم و دانش کا معاملہ ہے۔ وہ روز بروز پیچھے کی طرف جا رہا ہے۔ ایرک فرام کے نزدیک ذہانت سے مراد کسی عملی مقصد کو حاصل کرنے کی خاطر اشیا اور تصورات کو چالاکی سے استعمال کرنے کی اہلیت ہے۔ اس لحاظ سے وہ بندر بھی ذہین ہے جو دو چھڑیوں کو ملا کر درخت سے پھل اتار لیتا ہے۔ اس کے برعکس دانش اشیا کو کسی مقصد کی خاطر استعمال کرنے سے زیادہ انہیں سمجھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ صداقت کی جستجو پر مبنی ہے۔ تاہم نئے انسان کو اشیا کی ماہیت اور حقیقت سے دلچسپی نہیں۔ وہ انہیں محض استعمال کرنے کے جنون میں مبتلا ہے۔ دانش بھرپور انسانی شخصیت کا خاصہ ہے۔ اس لئے نئے انسان کو اس سے چڑ ہے۔ وہ اکثر اوقات اس کا تمسخر اڑاتا ہے۔ فلسفہ، ادب، ادب عالیہ اور فنونِ لطیفہ اس کے نزدیک بے

کاروں کے مشاغل ہیں۔ اگر اس نے مارکسیوں کے چند سیاسی نعرے سن رکھے ہیں تو وہ فوراً انہیں جاگیردارانہ عہد کے امرا اور ان کے مفت خور حاشیہ نشینوں کے چونچلے قرار دے دے گا۔

سماجی ہم آہنگی کو اصولِ حیات قرار دینے سے ضمیر کی خود بخود نفی ہو جاتی ہے۔ زندہ ضمیر کی علامت 'نہ' کہا گیا ہے۔ اس لئے جس قدر کوئی شخص ہجوم میں گم ہوتا ہے، اس کے ضمیر کی آواز اتنی ہی مدہم ہو جاتی ہے۔ انسان لائقِ فروخت بن جائے تو کسی معجزے کے ذریعے بھی ضمیر باقی نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ جدید سرمایہ دارانہ نظام میں انسان ضمیر کی کوئی خلش محسوس نہیں کرتا۔ بس چین کی بانسری بجاتا ہے۔ ضمیر کے ساتھ اخلاقیات بھی رخصت ہوتی ہے۔ دونوں کا چرچا باقی رہ جاتا ہے۔

مارکس نے محنت کو انسان کی باطنی ضرورت قرار دیا تھا۔ جس کے ذریعے وہ اپنی شخصیت کی تکمیل کرتا ہے۔ محنت کے ذریعے ہی انسان فطرت کی زنجیروں کو توڑ کر اُس کا آقا بنتا ہے۔ فطرت کو تبدیل کرتے ہوئے وہ اپنے آپ کو بھی بدلتا ہے اور اپنی تکمیل کے ارتقائی مراحل طے کرتا ہے اس لئے محنت تخلیق اور مسرت کا سرچشمہ ہے۔ مگر بیمار سماج میں محنت محض ایک ناگوار فرض اور رکاوٹ بن جاتی ہے۔ اسے زیادہ سے زیادہ کامیابی کے حصول کا وسیلہ خیال کیا جاتا ہے۔ اس صورت میں بھی محنت بذاتہ مقصد نہیں رہتی۔ بیمار سماج میں انسانوں کی اکثریت محنت فروخت کر کے زندگی برقرار رکھتی ہے۔ یوں کام جبری مشقت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ سپر کیپٹلزم میں انسانی محنت کا استحصال بھی نئی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اب انسان سے وہی کام لیا جاتا ہے جو مشین نہیں کر سکتی۔ اس طرح مشین انسانی قوت کا بدل ہونے کے بجائے انسان مشین کا بدل بن گیا ہے۔ پیٹر ایف۔ ڈرکر اس صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ محنت کشوں کی بڑی تعداد کے لئے کام کے معنی صرف تنخواہ حاصل کرنا ہے۔ انہیں کام یا پیداوار سے متعلقہ کسی شے سے دلچسپی نہیں رہی۔ محنت معاوضہ حاصل کرنے کا غیر فطری، ناپسندیدہ اور لغو وسیلہ بن گئی ہے۔ یہ بات مزدوروں کی بے چینی کا سبب ہے۔ کیونکہ تنخواہ کا چیک بہر طور اس قدر کافی نہیں کہ اس پر عزتِ نفس کی عمارت تعمیر کی جا سکے۔ یوں محنت کش محنت سے بے زار ہو کر اپنی ایک اور انسانی خصوصیت سے محروم ہو جاتا ہے۔

سپر کیپٹلزم میں انسان کی غیر انسانی صورت حال نے بے شمار نفسیاتی عوارض پیدا کئے ہیں۔ تاہم اس سماج کے پاسبان نفسیات دانوں نے اس بھیانک حقیقت کو چھپانے کے لئے کئی

رنگین پردے بنا رکھے ہیں۔ وہ اس بیمار ثقافت کے پیدا کردہ انسان کو مثالی فرد قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک مطابقت پذیری، تعاون پسندی، جارحیت، برداشت اور آرزومندی ذہنی صحت و بلوغت کی علامات ہیں۔ جبکہ ذاتی تحفظ یعنی تشویش سے آزادی، قربت کی حاجت یعنی کم از کم ایک فرد کی رفاقت اور جنسی تسکین انسان کی بنیادی ضروریات ہیں۔ بظاہر اس سے اختلاف کی گنجائش نظر نہیں آتی کہ ہر انسان تحفظ، محبت اور جنسی تسکین کا خواہش مند ہوتا ہے۔ تاہم ایرک فرام کے نزدیک جب ان باتوں کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بیمار معاشرے میں ان کا مفہوم کس قدر مسخ ہوسکتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ دیکھئے کہ ہر حساس آدمی کبھی نہ کبھی ضرور اُداس ہوتا ہے۔ وہ عدم تحفظ کے احساس سے بھی ہمیشہ محفوظ نہیں رہ سکتا۔ صحت مند فرد کا نفسیاتی معیار یہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ ہر اعتبار سے اپنے تئیں محفوظ سمجھتا ہے۔ بلکہ یہ کہ وہ کسی بحران میں اعتماد اور حوصلے کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرسکتا ہے۔

نئے سماج میں محبت بھی انسانی خصوصیات سے محروم ہوگئی ہے۔ اس کا تعین منڈی کے اصولوں کی طرز پر ہوتا ہے اور اسے اس ہاتھ دو اس ہتھ لو، والا معاملہ خیال کیا جاتا ہے تاہم محبت باہمی انصاف کا مسئلہ نہیں بلکہ مسرت کا سرچشمہ ہے۔ حقیقی مسرت تخلیقی زندگی اور محبت و دانش کی صلاحیتوں سے کام لینے سے عبارت ہے۔

ذہنی و روحانی اعتبار سے صحت مند فرد محبت، عقل و دانش اور یقین محکم کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کے نزدیک زندگی بذاتہ اہم ہے اور اس کا احترام کرتا ہے۔ نفسیاتی طور پر بیمار انسان اپنی ذات کے خول میں بند ہوکر رہ جاتا ہے۔ خارجی دنیا کے ساتھ اس کے رابطے منقطع ہوجاتے ہیں۔ ایرک فرام کے حوالے سے بحث کرتے ہوئے ہمیں یہ امر پیش نظر رکھنا چاہیے کہ اس کے نزدیک نفسیاتی صحت سماج سے فرد کی ہم آہنگی کے مساوی اس کے برعکس وہ دعویٰ کرتا ہے کہ نفسیاتی صحت کے لئے ضروری ہے کہ سماج فرد کی ضروریات سے مطابقت اختیار کرے۔ گویا فرد کی ذہنی صحت کوئی انفرادی معاملہ نہیں۔ بلکہ اس کا انحصار سماجی ڈھانچے پر ہے۔ صحت مند سماج وہ ہے جو انسان کی ضروریات احسن طور پر پوری کرے۔

سپر کیپٹلزم میں انسان کی المناک صورت حال کا گہرا شعور رکھتے ہوئے بھی ایرک فرام رجائیت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ وہ لکھتا ہے کہ تہذیبی ارتقا کا نقطۂ آغاز یہ امرِ واقعہ ہے کہ عالم فطرت جو انسان کا اصلی گھر تھا، اس سے چھوٹ گیا ہے۔ واپسی کی راہ مسدود ہے کہ اب انسان

دوبارہ حیوان نہیں بن سکتا۔ اب ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ انسان نیا گھر تلاش کرے۔ خود پورا انسان بنے اور اپنی دنیا کو انسانی خوبیوں سے آراستہ کرے۔ اس دنیا کے نقش و نگار اجاگر کرتے ہوئے آسکر وائلڈ کی طرح ایرک فرام پہلی خوبی اسے قرار دیتا ہے کہ یہ ایسا سماج ہوگا جس میں کوئی فرد کسی دوسرے فرد کے مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں ہوگا۔ ہر فرد محض اپنی فطری صلاحیتوں کے اظہار کے لئے محنت کرے گا۔ اس سماج میں انسان کو مرکزی حیثیت حاصل ہوگی اور ہر قسم کی معاشی اور سیاسی سرگرمیوں کا مقصد اس کی نشوونما میں معاونت کرنا ہوگا۔ اس مثالی سماج میں استحصال، لالچ، ملکیت پسندی اور نرگسیت کو مادی فوائد یا اثر و رسوخ بڑھانے کے لئے بروئے کار نہیں لایا جاسکے گا۔ ضمیر کو آزادی حاصل ہوگی۔ موقع پرستی اور بے اصولی کو سماج دشمنی سے تعبیر کیا جائے گا۔ اس سماج میں فرد کی ذات کو نشوونما حاصل ہوگی اور انفرادی مسائل اجتماعی مسائل بن جائیں گے۔

یہ صحت مند سماج فرد کو اجتماعی زندگی میں بھرپور حصہ لینے کے قابل بنائے گا۔ محبت کی راہیں کشادہ ہوں گی۔ محنت کا تخلیقی کردار اجاگر ہوگا۔ عقل و دانش کو فروغ حاصل ہوگا۔ انسان کی روحانی خواہشیں اجتماعی فنون میں اظہار پائیں گی۔ ایرک فرام کے نزدیک یہ سب کچھ ممکن ہے اگر ہم یہ تسلیم کرلیں کہ عہد حاضر میں نسل انسانی کو ہمہ گیر انسانی انقلاب کی ضرورت ہے۔ وہ مدعی ہے کہ اس زمانے میں فطری علوم کو ترقی دینے کے لئے جس قدر مالی وسائل اور ذہنی صلاحیتیں صرف ہورہی ہیں، اگر ان کا تھوڑا سا حصہ بھی انسانی صورت حال کو سدھارنے پر صرف کی جائے تو یہ خواب شاعر کا خیال نہیں رہے گا۔

محنت کا نفسیاتی پہلو سپر کیپٹیلزم میں انسانی المیے کا منبع ہے۔ لہٰذا پسندیدہ تبدیلی کا انحصار محنت کش کی مغائرت دور کرنے پر ہے۔ اس کا واحد طریقہ ایرک فرام کے نزدیک یہ ہے کہ مزدور کو سرمائے کا غلام نہ بنایا جائے۔ بلکہ اسے سرمائے پر حاوی ذمہ دار فرد بنایا جائے۔ مطلب یہ نہیں کہ ذرائع پیداوار مزدور کے حوالے کردیے جائیں بلکہ یہ کہ اُسے پالیسی اور نظم و نسق میں شریک کیا جائے۔ سرمایہ دار کو منافع کا معقول حصہ ملتا رہے مگر اسے محنت کشوں پر لامحدود اختیارات حاصل نہ رہیں۔ اس طرح محنت کش فعال، ذمہ دار اور دلچسپی سے کام کرنے والا کارکن بن سکتا ہے۔ برطانوی لیبر گورنمنٹ کی اصلاحات کے مداح جان سٹریچے کی طرح ایرک فرام کا خیال بھی یہ ہے کہ اگر پبلک کمپنیوں کو ان کارکنوں اور پورے معاشرے کے روبرو جوابدہ بنادیا جائے تو

موجودہ صورت حال میں بہت سی خوشگوار تبدیلیاں پیدا ہوسکتی ہیں۔

یہ امر روز روشن کی طرح واضح ہے کہ محنت کو دیگر سماجی، سیاسی اور ثقافتی سرگرمیوں سے الگ تھلگ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ سب مل کر ایک اکائی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لہٰذا محنت کی صورت حال کو انسانی صورت حال بنادیا جائے اور زندگی کے دیگر شعبوں میں ایسی ہی تبدیلیاں نہ لائی جائیں تو اس سے کوئی خوش گوار نتیجہ پیدا نہیں ہوگا۔ لہٰذا اصل مسئلہ پورے سماجی ڈھانچے کی تشکیل نو ہے۔

آر۔ مورے نے خوب کہا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ لوگوں کو ان کی اشیا سے ہمیشہ غیر مطمئن رکھتا ہے تاکہ وہ نت نئی مصنوعات کے پیچھے دیوانہ وار بھاگتے رہیں۔ لیکن بقول زاہد ڈار، دنیا کی چیزیں اندر کے خلا کو پُر نہیں کرسکتیں، اس لئے سرمایہ دارانہ سماج میں انسان کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔ یہ نظام کی میکانیت کا ناگزیر نتیجہ ہے۔ مگر ایرک فرام امریکیوں کو مشورہ دیتا ہے کہ وہ نت نئے مصنوعات کے پیچھے بھاگنے کی 'بدعادت' ترک کردیں۔

ایرک فرام کے نزدیک آمدنی میں فرق اس قدر نہیں ہونا چاہیے کہ مختلف طبقات کے زندگی کے تجربے میں فرق پیدا ہوجائے۔ آمدنی میں فرق بذاتہ اہم نہیں۔ لیکن جب معاشی زندگی میں مقدار کا فرق کیفیت کا فرق بن جائے تو سماجی استحکام کے لئے خطرہ لاحق ہوجاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمارا دانشور سماجی تحفظ کی موجودہ امریکی سہولتوں کو زیادہ ہمہ گیر بنانے پر زور دیتا ہے تاکہ کوئی شہری زندگی کے بنیادی تقاضوں کو انسانی سطح پر پورا کرنے سے محروم نہ رہے۔

○

ایریخ فروم

آزادی کا خوف

آزادی۔ایک نفسیاتی مسئلہ

جدید یوروپی اور امریکی تاریخ آدمیوں کو جکڑنے والی سیاسی، معاشیاتی اور روحانی زنجیروں سے رہائی پانے کی کوشش کے گرد مرقوم ہے۔ آزادی کی جنگیں مظلوموں نے لڑیں، نئی آزادیوں کے لیے، ان کے خلاف جو اپنی اجارہ داریوں کو بچانا چاہتے تھے۔ تسلط سے چھٹکارا پانے کے لیے جدوجہد کے دوران میں مظلوموں کے اس طبقے کو یقین ہوتا تھا کہ وہ اس طرح انسانی آزادی کی خاطر سرگرم پیکار ہے۔ اور یوں ایک آدرش کو، آزادی کی اس آرزو کو جو تمام ظلم رسیدوں کے دل میں ہوتی ہے، متاثر کرنے کے قابل ہو جاتا تھا۔ بہر حال، آزادی کی اس طویل اور فی الواقع مسلسل جنگ میں وہی طبقے، جو ایک وقت میں استبداد کے خلاف جدوجہد کر رہے تھے، فتح حاصل ہونے کے بعد جب نئے حقوق کی حفاظت کا وقت آیا تو آزادی کے دشمنوں سے مل گئے۔

بہت سی شکستوں کے باوجود آزادی نے لڑائیاں جیتی بھی ہیں۔ بہت سے لوگ اس یقین کے ساتھ ان لڑائیوں میں کھیت رہے کہ استبداد کے خلاف جنگ کرتے ہوئے مارا جانا آزادی کے بغیر زندہ رہنے سے بہتر تھا۔ ایسی موت ان کی انفرادیت کے ادعا کی انتہا تھی۔ معلوم ہوتا تھا ہے تاریخ یہ ثابت کر رہی تھی کہ انسان کے لیے اپنے اوپر حکومت کرنا، اپنے لیے فیصلے کرنا اور ویسے سوچنا اور محسوس کرنا جیسے اس کی نظر میں مناسب ہو، ممکن ہے، اس مطمح نظر سے، جس کی طرف معاشرتی ترقی تیزی سے بڑھ رہی تھی، معلوم ہوتا تھا، انسان کی صلاحیتوں کا مکمل اظہار مراد تھا۔ معاشیاتی حریت پسندی، سیاسی جمہوریت، مذہبی خودمختاری اور ذاتی زندگی میں انفرادیت پسندی کے اصولوں نے آزادی کی لگن کا اظہار کیا اور ساتھ ہی، بظاہر، انسانیت کو آزادی کے حصول

کے قریب تر پہنچا دیا یکے بعد دیگرے رابطے منقطع ہوتے گئے۔ انسان نے فطرت کے تسلط کا خاتمہ کر دیا تھا اور خود اس کا مالک بن بیٹھا تھا؛ اس نے کلیسا اور مطلق انسان حکومت کے تسلط کا تختہ الٹ دیا تھا۔ خارجی تسلط کا خاتمہ اس محبوب مقصد یعنی فرد کی آزادی حاصل کرنے کی محض ضروری ہی نہیں وافی شرط معلوم ہوتا ہے۔

بہت سوں نے پہلی جگ عظیم کو فیصلہ کن کشمکش اور اس کے خاتمے کو آزادی کی قطعی فتح سمجھا۔ بظاہر موجود جمہوریتیں مستحکم ہو گئیں اور پرانی بادشاہتوں کی جگہ نئی جمہوریتوں نے لے لی۔ لیکن چند ہی سال گزرے تھے کہ نئے نظاموں نے ظہور میں آ کر ہر اس چیز کو جھٹلا دیا جسے لوگ سمجھتے تھے کہ انہوں نے صدیوں کی جدوجہد کے بعد حاصل کی تھی؛ کیونکہ ان نئے نظاموں کا، جو موثر طور پر انسان کی تمام سماجی اور ذاتی زندگی پر حکمران ہو گئے تھے، جوہر یہ تھا کہ سب لوگ، مٹھی بھر لوگوں کے سوا، ایک ایسے اقتدار کے سامنے سر جھکا دیں، جس پر وہ اختیار نہ رکھتے ہوں۔

ابتدا میں بہت سوں کی اس خیال سے ڈھارس بندھی کہ مطلق العنان نظام کی فتح چند افراد کے جنون کا نتیجہ تھی اور یہی جنون وقت آنے پر ان کے زوال کا باعث ہوگا۔ دوسروں نے اطمینان سے یہ فرض کر لیا کہ چونکہ اطالوی یا جرمن عوام نے جمہوریت کی کافی طویل عرصے تک تربیت نہ پائی تھی اس لیے ان کا دیگر مغربی جمہوریتوں کی سی سیاسی پختگی تک پہنچنے کا بے کیفی سے انتظار کیا جا سکتا تھا۔ ایک اور عام، باطل تصور، جو غالباً سب سے زیادہ خطرناک تھا، یہ تھا کہ ہٹلر جیسے آدمیوں نے حکومت کی عظیم سامگری پر صرف فریب کاری اور عیاری سے قابو پا لیا ہے؛ کہ وہ اور ان کے تابعین محض طاقت کے بل بوتے پر حکومت کر رہے ہیں کہ تمام رعایا دھوکے اور دہشت کا بے بس شکار ہے۔

بعد ازاں، آنے والے سالوں میں ان دلائل کا فریب کھل گیا۔ ہم یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ جرمنی میں لاکھوں اپنی آزادی سے دست بردار ہونے کے اتنے ہی متمنی تھے جتنے ان کے اباواجداد اس کی خاطر لڑنے کے؛ کہ انہوں نے آزادی چاہنے کی بجائے اس سے فرار کے رستے ڈھونڈے؛ کہ لاکھوں دوسرے بے اعتنا تھے اور آزادی کے تحفظ کی خاطر لڑنے اور مرنے کے قائل نہ تھے۔ ہم یہ بھی جان گئے ہیں کہ جمہوریت کی بحرانی حالت مخصوص طور پر اطالوی یا جرمن مسئلہ نہیں، بلکہ ایسا مسئلہ ہے جو ہر جدید حکومت کو درپیش ہے۔ اور اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا کہ انسانی آزادی کے دشمنوں نے کیا علامتیں چنی ہیں۔ اگر آزادی پر فاشست دشمنی یا کھلم کھلا

فاشزم کے نام پر حملہ کیا جائے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ کم خطرے میں ہے۔ اس سچائی کو جون ڈیوی نے اس قدر موثر طور پر اصول کی صورت میں پیش کیا ہے کہ میں اس خیال کو اسی کے الفاظ میں ادا کرتا ہوں۔ وہ کہتا ہے: ''ہماری جمہوریت کو جو سنگین اندیشہ درپیش ہے وہ غیر ملکی مطلق العنان حکومت کے وجود سے نہیں۔ یہ خود ہمارے ذاتی طرزِ عمل میں، ہمارے اپنے اداروں میں ان حالات کا وجود ہے۔ جنہوں نے دوسرے ملکوں میں خارجی حکومت، نظم اور یک رنگی اور قائد کا دستِ نگر ہونے کو فتح دلائی ہے۔ اس لحاظ سے جنگ کا میدان یہاں خود ہمارے اور ہمارے اداروں کے اندر بھی ہے۔'' (آزادی اور کلچر)

فاشزم کو ابھارنے والے معاشی اور سماجی حالات کے مسئلے کے علاوہ بھی ایک انسانی مسئلہ ہے جسے سمجھنا ضروری ہے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ جدید انسان کے کردار کی ساخت کے ان محرک عناصر کا تجزیہ کیا جائے جنہوں نے اسے فاشسٹ ملکوں میں آزادی سے دست بردار ہونے کا خواہشمند بنا دیا اور جو خود ہمارے لاکھوں عوام میں اتنے عام ہیں۔

جب ہم آزادی کے انسانی پہلو، اطاعت کی خواہش اور حکمرانی کی ہوس پر نظر ڈالتے ہیں تو مندرجہ ذیل سوال پیدا ہوتے ہیں: بطور انسانی تجربہ آزادی کیا ہے؟ کیا آزادی کی خواہش انسان کی فطرت میں خلقی طور پر موجود ہوتی ہے؟ کیا آزادی ہر ایک کے لیے یکساں تجربہ ہوتی ہے اور اس بات سے اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آدمی کس قسم کے تمدن میں رہتا سہتا ہے یا یہ انفرادیت کے اس درجے کے مطابق جو کہ خاص معاشرے میں حاصل کیا جا چکا ہو، بدلتی رہتی ہے؟ کیا آزادی محض خارجی دباؤ کی غیر موجودگی ہے یا کسی چیز کی موجودگی بھی ہے، گر ہے تو کس چیز کی؟ وہ معاشی اور سماجی اسباب کیا ہیں جو معاشرے میں آزادی کی جدوجہد کی ابتدا کرتے ہیں؟ کیا آزادی ایسا بوجھ بھی ثابت ہو سکتی ہے جو آدمی سے اٹھ نہ سکتا ہو، کوئی ایسی چیز جس سے وہ فرار ہونے کی کوشش کرے؟ پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ آزادی بہت سوں کے لیے ایک محبوب مقصود ہے۔ اور دوسروں کے لیے ایک خطرہ؟

اور کیا آزادی کی خلقی آرزو کے علاوہ، شاید، اطاعت کی ایک فطری خواہش نہیں ہوتی؟ اگر نہیں ہوتی تو اس دلکشی کی ہمارے پاس کیا توجیہ ہے جو کسی قائد کے مطیع ہو جانے میں آج کل بہت سوں کو دکھائی دیتی ہے؟ کیا اطاعت ہمیشہ کسی مبین آمر کی جاتی ہے یا ان آمرمروں کی بھی جو داخل بن چکے ہوں، مثلاً فرض یا ضمیر یا داخلی قیدی کی یا بے نام آمروں کی، جیسے رائے عامہ؟ کیا

اطاعت میں کوئی پوشیدہ تسکین ہے اور اس کا جوہر کیا ہے؟

وہ کیا ہے جو آدمی میں طاقت کے لیے سیر نہ ہونے والی ہوس پیدا کرتی ہے؟ کیا اس کا سبب ان کی حیاتی توانائی کا زور ہے یا ایک بنیادی کمزوری اور زندگی کو خود روی اور محبت سے بسر کرنے کی نااہلیت ہے؟ وہ نفسیاتی حالات کیا ہیں جو ان کاوشوں کے زور کا باعث ہوتے ہیں؟ اور وہ سماجی حالات کیا ہیں جن پر ایسے نفسیاتی حالات بذات خود مبنی ہیں؟

آزادی اور آمریت کے انسانی پہلوؤں کا تجزیہ ہمیں ایک عام مسئلے پر غور کرنے پر مجبور کرتا ہے؛ یعنی اس کام پر جو نفسیاتی اسباب معاشرتی عمل میں سرگرم طاقتوں کے طور پر کرتے ہیں؛ اور یہ، بالآخر، معاشرتی عمل میں نفسیاتی، معاشیاتی اور نظریاتی اسباب کے تفاعل کے مسئلے کی طرف لے جاتا ہے۔ فاشزم بڑی قوموں کے لیے جس کشش کا حامل ہے اسے سمجھنے کی ہر کوشش ہمیں نفسیاتی اسباب کی کارفرمائی تسلیم کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ کیونکہ ہم یہاں ایک ایسے سیاسی نظام پر بات کر رہے ہیں، جو خالصتاً، خود مطلبی کی عقل قوتوں کے لیے جاذبیت نہیں رکھتا۔ بلکہ آدمی میں وہ شیطانی قوتیں بیدار اور جنگ کے لیے تیار کر دیتا ہے جو ہمیں یقین تھا، وجود ہی نہیں رکھتیں یا مدت ہوئے ختم ہو چکیں۔ گزشتہ صدیوں میں آدمی کا جانا پہچانا حلیہ یہ تھا کہ وہ ایک عقلی ہستی ہے، جس کے ذاتی افعال کو اس کا ذاتی مفاد اور ذاتی مفاد کے مطابق عمل کرنے کی اہلیت معین کرتے ہیں۔ ہوبز جیسے مصنف تک نے، جو یہ سمجھ گیا تھا کہ انسان کو مہمیز کرنے والی قوتیں طاقت کی ہوس اور عداوت ہیں، ان قوتوں کے وجود کی تشریح یہ کی تھی کہ یہ خود مطلبی کے منطقی نتائج ہیں۔ چونکہ سب، آدمی برابر ہیں اور خوشی کی یکساں خواہش رکھتے ہیں اور چونکہ اتنی دولت موجود نہیں کہ سب کی یکساں طور پر تسلی ہو سکے، وہ لازماً ایک دوسرے سے لڑتے ہیں اور جس چیز کے مالک ہیں اس سے آئندہ لطف .. کے لیے طاقت کے خواہاں ہیں۔ لیکن ہوبز کی یہ تصویر دقیانوسی ہو گئی۔ اوسط طبقہ پچھلے سیاسی یا مذہبی حکمرانوں کی طاقت توڑنے میں جتنا کامیاب ہوا، لوگ فطرت کو رام کرنے میں جتنے کامیاب ہوئے اور جتنے لاکھوں لوگ معاشیاتی طور پر آزاد ہو گئے، عقلی دنیا میں اور آدمی کے خالصتاً عقلی ہستی ہونے میں یقین اتنا ہی بڑھتا گیا۔ انسان کی فطرت کی تاریک اور شیطانی قوتوں کو ازمنۂ وسطیٰ اور اس سے بھی پرانے زمانوں کو لوٹا دیا گیا اور علم کی کمی یا مکار بادشاہوں اور ملاؤں کی شاطرانہ سازشیں ان کی وجہ قرار دی گئی۔

جب فاشزم اقتدار پر آئی تو بیشتر لوگ نظری طور پر تیار تھے نہ عملی طور پر۔ انہیں یقین نہ

آتا تھا کہ آدمی شر سے اتنا لگاؤ، طاقت کی ایسی ہوس، کمزوروں کے حقوق سے اتنی بے اعتنائی اور اطاعت کی ایسی تمنا کا اظہار کر سکتا ہے۔ صرف چند لوگ تھے جنہوں نے اس وفور سے قبل آتش فشاں کی گڑگڑاہٹ سنی تھی۔ نطشے انیسویں صدی کی مطمئن رجائیت میں خلل ڈال چکا تھا؛ مارکس نے بھی یہی کیا تھا، مگر دوسری طرح کچھ عرصہ بعد خطرے کی خبر فرائڈ سے ملی تھی، جس نے ہمیں آتش فشاں کی چوٹی پر لے جا کر کھولتے ہوئے دہانے میں جھانکنے پر مجبور کیا تھا۔

انسانی طرزِ عمل کے کچھ اجزاء کو معین کرنے والی ان غیر عقلی اور لاشعوری قوتوں کے مشاہدے اور تجزیے کی طرف توجہ مبذول کرنے میں فرائڈ اپنے پیش روؤں سے بہت آگے بڑھ گیا۔ اس نے، اور جدید نفسیات میں اس کے مقلدوں نے، نہ صف انسانی فطرت کے غیر عقلی اور لاشعوری حصے کو بے نقاب کر دیا، جس کے وجود کو جدید عقلیت نے نظر انداز کر رکھا تھا، بلکہ یہ بھی دکھایا کہ یہ غیر عقلی مظہر چند قوانین کے تابع تھے اور اس لیے انہیں عقلاً سمجھنا ممکن تھا۔ اس نے ہمیں خوابوں اور جسمانی علامتوں کی زبان بھی سکھائی اور انسانی طرزِ عمل کی غیر عقلی باتیں بھی۔ اس نے معلوم کیا کہ یہ غیر عقلی باتیں اور فرد کے تمام کردار کی ساخت بھی ان اثرات کا ردِ عمل ہیں جو خارجی دنیا نے اس پر ڈالے تھے، خصوصاً اثرات کا جو عنفوانِ طفل میں ہوئے ہوں۔

فرائڈ اپنے کلچر کی روح میں اتنا ڈوبا ہوا تھا کہ اس کی عاید کردہ حدود سے آگے قدم نہ بڑھا سکا۔ یہی حدود مریض فرد کو سمجھنے میں اس کے لیے رکاوٹ بن گئیں؛ طبعی فرد اور معاشرتی زندگی میں کارفرما غیر عقلی مظہر کو سمجھنے میں وہ ان کی وجہ سے ناکام رہا۔

چونکہ تجزیہ فرائڈ کی چند بنیادی دریافتوں پر مبنی ہے۔ خصوصاً ان پر جو انسانی کردار میں لاشعوری قوتوں کی سرگرمی اور ان کی خارجی اثرات پر منحصر ہونے کے متعلق ہیں۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اگر آغاز ہی میں اپنے نقطۂ نظر کے چند عام اصولوں کو، اور کلاسیکی فرائڈی نظریوں اور اس نقطۂ نظر کے اہم اختلافات کو بیان کر دیا جائے تو قاری کو آسانی رہے گی۔

انسان اور معاشرے کے مابین ایک بنیادی اور قسمت پر روایتی یقین فرائڈ کو قبول تھا اور انسانی فطرت کی معصومیت کا روایتی نظریہ بھی۔ اس کی نظریہ میں آدمی بنیادی طور پر تمدن دشمن ہے۔ معاشرے کا فرض ہے کہ اسے سدھائے اور حیاتیاتی (اور اس لیے ناقابل استیصال) رجحانات کی تھوڑی بہت براہِ راست تسکین کی اجازت دے؛ لیکن معاشرے کو زیادہ تر یہی چاہیے کہ آدمی کی بنیادی تشویقوں کو شائستہ بنائے اور ہنرمندی سے ان کی روک تھام کرے۔ معاشرے

کی فطری تشویقوں کو اس طرح کچلنے سے ایک حیرت انگیز بات واقع ہوتی ہے۔ دبے ہوئے رجحانات ایسی کوششوں میں بدل جاتے ہیں جو تمدنی اعتبار سے گراں قدر ہوتی ہیں اور یوں تمدن کی انسانی اساس بن جاتی ہیں۔ امتناع کا اس عجیب طرح متمدن طرزِ عمل میں بدل جانے کا نام فرائڈ نے قصیدہ رکھا تھا۔ اگر امتناع کی مقدار قصید کی صلاحیت سے زیادہ ہو تو افراد اعصابی مریض ہو جاتے ہیں اور امتناع میں کمی روا رکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ بہر حال، آدمی کے رجحانات کی تسکین او تمدن میں ایک معکوس رابطہ ہے؛ جتنا زیادہ متناع، اتنا زیادہ مدن (اور اعصابی اضطراب کا اتنا ہی زیادہ خدشہ) فرائڈ کے نظریے میں فرد اور معاشرے کا باہمی رابطہ خالصتاً ایک ساکن رابطہ ہے: فرد تقریباً یکساں رہتا ہے اور صرف اسی حد تک بدلتا ہے جتنا زیادہ کہ معاشرہ اس کے فطری رجحانات پر دباؤ ڈالتا ہے (اور یوں زیادہ تصعید نافذ کر دیتا ہے) یا تکسین کا زیادہ موقع دیتا ہے) اور یوں متمدن کو قربان کر دیتا ہے)۔

آدمی کی ان نام نہاد بنیادی جبلتوں کی طرح، جنہیں پچھلے نفسیات دانوں نے مان رکھا تھا، فرائڈ کا انسانی فطرت کا تصور، بالذات، جدید انسان میں نظر آنے والے اہم ترین رجحانات کا عکس تھا۔ فرائڈ کے لیے، اس کے تمدن کا فرد ''انسان'' کا نمائندہ تھا اور جدید تمدن میں جو جذبات اور پریشانیاں آدمی سے مختص ہیں انہیں وہ دائمی قوتیں سمجھا گیا جو آدمی کی حیاتیاتی ساخت میں اثول ہیں۔

گو اس امر کی ہم بہت سی مثالیں پیش کر سکتے ہیں (مثال کے طور، جیسے تعقید اور ویس، عورتوں کی نامن ہاد تعقید آختگی، جو جدید مردوں میں پھیلی ہوئی عداوت کی معاشتی اساس ہے) میں یہاں صرف ایک مثال اور دینا چاہتا ہوں، جو خاص طور پر اہم ہے، کیونکہ وہ انسان کے معاشری ہستی ہونے کے تمام تصور سے متعلق ہے۔ فرائڈ ہمیشہ فرد کو اس کے دوسروں سے تعلقات کی روشنی میں دیکھتا ہے۔ یہ تعلقات فارئڈ کی نظر میں، دوسروں سے معاشیاتی تعلقات سے مشابہ ہیں، جو سرمایہ دار معاشرے میں فرد کا خاصہ ہیں۔ لیکن فرد را جنس کروسو نہیں ہوتا اور اسے بطور خریدار، نوکر یا مالک دوسروں کی ضرورت رہتی ہے۔ اس کے لیے خریدنا اور بیچنا، لینا اور دینا لازم ہیں۔ بازار خواہ اس کا تعلق مزدوروں سے ہو یا تجارتی اشیاء سے، ان تنقات کو منضبط کرتا ہے۔ چنانچہ فرد، جو بنیادی طور پر تنہا اور خود آسودہ ہوتا ہے، دوسروں سے معاشیاتی تعلقات ایک مقصد پورا کرنے کے لیے قائم کرتا ہے: خریدنے اور بیچنے کے لیے۔ فرائڈ کا انسانی تعلقات کا تصور اصل میں یہی ہے:

فرد حیاتیاتی طور پر ملی ہوئی ایسی خواہشوں سے پوری طرح لیس نظر آتا ہے جن کی تسکین ضروری ہے۔ ان کی تسکین کی غرض سے فرد دورے ''معروضوں'' سے تعلقات قائم کرتا ہے۔ اس طرح دوسرے لوگ ہمیشہ فرد کا مقصد پورا کرنے کا وسیلہ ہوتے ہیں۔ مقصد ان خواہشات کی تسکین ہے جو خود فرد میں، دوسروں سے تعلق پیدا کرنے سے پہلے، پیدا ہوتی ہیں۔ فرائڈ کے مفہوم میں انسانی تعلقات کا حلقۂ عمل بازار سے مشابہ ہے۔ وہ حیاتیاتی ضرورتوں کی تسکین کا مبادلہ ہے، جس میں دوسرے فرد سے تعلق ہمیشہ مقصد پورا کرنے اوسیلہ ہوتا ہے، کبھی خود مقصد نہیں ہوتا۔

فرائڈ کے نقطۂ نظر کے برخلاف یہاں جو تجزیہ پیش کیا گیا ہے وہ اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ فرد اور دنیا کے درمیان رابطے کی نوعی قسم نفسیات کا مرکزی مسئلہ ہے نہ کہ مختلف جبلتی ضرورتوں کی فی نفسہٖ تسکین یا تسکین سے محرومی؛ مزید براں اس مفروضہ پر کہ انسان اور معاشرے کا تعلق ساکن نہیں ہے۔ وہ ایسا نہیں ہے کہ ایک طرف ہمارے پاس ایک فرد کو جیسے فطرت نے خاص خواہشیں دے رکھی ہوں اور دوسری طرف معاشرہ اس سے کوئی علیحدہ شے ہو جو ان خلقی میلانات کو تسکین پہنچاتی ہو یا تسکین سے محرومی رکھتی ہو۔ گو ایسی ضرورتیں موجود ہیں۔ مثلاً بھوک اور پیاس اور کامنا، جو آدمیوں میں مشترک ہیں، وہ سب خواہشتیں جو آدمیوں کے کرداروں میں تنع پیدا کرتی ہیں، جیسے محبت اور نفرت، اقتدار کی ہوس، اطاعت کی تمنا، حواسی لذت سے محفوظ ہونا یا اس سے ڈر، معاشری عمل کی پیداوار ہیں۔ آدمی کے سب سے جمیل اور سب سے کریہہ رجحان حیاتیاتی طور پر ملی ہوئی معین انسانی فطرت کے اجزا نہیں بلکہ اس معاشرے عمل کے نتائج ہیں جو انسان کی تخلیق کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں، معاشرے کا عمل محض امتناعی نہیں (گو وہ امتناعی بھی ہے) تخلیقی بھی ہے۔ انسان کی فطرت، اس کے جذبات اور پریشانیاں تمند کی پیداوار ہیں۔ امرِ واقعی یہ ہے کہ مسلسل انسانی جہد کی، جس کے اندراج کو ہم تاریخ کہتے ہیں: سب سے اہم تخلیق اور کارِ نمایاں خود انسان ہے۔

معاشرتی نفسیات کا بعینہٖ یہی کام ہے کہ تاریخ میں انسان کی تخلیق کے اس عمل کو سمجھے۔ ایک تاریخی عہد کے بعد دوسرے میں انسان کے کردار میں چند قطعی تبدیلیاں کیوں واقع ہوتی ہیں؟ نشاۃ ثانیہ کی روح قرونِ وسطیٰ کی روح سے مختلف کیوں ہے؟ اجارہ پسند سرمایہ داری میں انسان کے کردار کی ساخت انیسویں صدی کے انسان سے کیوں نہیں ملتی؟ یہ سمجھانا معاشری نفسیات کے ذمے ہے کہ نئی صلاحیتیں اور نئے جذبات، بُرے یا بھلے، کیوں وجود میں آتے ہیں۔ یوں ہمیں پتہ

چلتا ہے کہ نشاۃِ ثانیہ سے ہمارے زمانے تک آدمیوں میں شہرت کی گند ہوس بھری رہی ہے، لیکن یہ خواہش جو فی زمانہ اتنی فطری معلوم ہوتی ہے، قرونِ وسطیٰ کے معاشرے کے انسان میں بہت کم پائی جاتی تھی۔ اسی دور میں انسانوں نے فطرت کے حسن کی ایسی حس کی تکمیل کی جو پہلے ان میں موجود نہ تھی۔ نیز، شمالی یورپ کے ملکوں میں، سولہویں صدی کے بعد، آدمیوں کو کام کرنے کا ایسا دیوانہ وار شوق ہوا جو اس سے پہلے آزاد انسانوں میں نہ ہپایا جاتا تھا۔

لیکن نہ صرف تاریخ انسان کو بناتی ہے۔ خود انسانت اریخ بناتا ہے۔ اس ظاہری تخالف کا حل معاشری نفسیات کے حلقۂ عمل کی تشکیل ہے۔ اس کا کام صرف یہی ثابت کرنا نہیں کہ جذبات، خواہش اور پریشانیاں معاشرے عمل کے نتائج کی بنا پر کس طرح بدلتی وار بڑھتی ہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ انسان کی قوتیں یوں نوعی اشکال میں ڈھل کر، اپنی باری آنے پر، تخلیقی قوتیں بن جاتی ہیں، جو معاشری عمل کو گھڑتی ہیں۔ اس لیے، مثال کیطور پر، شہرت اور کامیابی کی لگن اور کام کی خواہش وہ قوتیں ہیں جن کے بغیر جدید سرمایہ داری ترقی نہ کرسکتی تھی جو ان کے اور کئی دیگر انسانی قوتوں کے بغیر انسان کے پاس جدید تجارتی اور صنعتی نظام کی معاشیاتی اور معاشری ضرورتوں کے مطابق کام کرنے کی قوتِ محرکہ ہی نہ ہوتی۔

جو کچھ ہم کہ چکے ہیں اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پیش کردہ نقطۂ نظر فرائڈ کے نقطۂ نظر سے مختلف ہے؛ اس وجہ سے کہ فرائڈ نے تاریخ کی جو توضیح کی ہے کہ وہ ان نفسیاتی قوتوں کا نتیجہ ہے جو بذاتِ خود معاشری طور پر مشروط نہیں یہ نقطۂ نظر اس سے شدید طرح پر غیر مطابق ہے۔ یہ ان نظریوں سے بھی، جو انسانی عنصر کے حصے کو معاشری عمل کے محرک اجزا میں سے ایک ماننے سے تغافل برتتے ہیں، اتنی ہی شدی دطرح مطابقت نہیں رکھتا۔ یہ صرف انہیں معاشری نظریوں کی (جیسے ڈرک ہیم اور اس کے دبستان کے) تنقید نہیں جو صریحاً نفسیاتی مسائل کو عمرانیات سے خارج کرنا چاہتے ہیں، ان نظریوں کی بھی ہے جن میں کم یا زیادہ طرز عملی نفسیات کی جھلک موجود ہے۔ صرف ایک متحرک نفسیات، جس کی بنیاد فرائڈ رکھ چکا ہے، انسانی عنصر سے زبانی ہمدردی کرنے سے آگے بڑھ سکتی ہے۔ انسانی فطرت مثبوت نہیں، مگر ہم اسے نامحدود طور پر اس قدر لوچ دار قرار نہیں دے سکتے کہ وہ ایک ذاتی نفسیاتی حرکیت پیدا کیے بغیر خود کو ہر طرح کے حالات کے مطابق بنانے کے قابل ہو۔ انسانی فطرت گو تاریخی ارتقا کی پیداوار ہے، چند جبلی قوانین اور مشینی نظام رکھتی ہے جنہیں دریافت کرنا نفسیات کا کام ہے۔

جو کچھ کہا گیا اور جواب آگے کہا جائے گا اسے پوری طرح سمجھانے کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر مطابقت کے تصور پر بحث کی جائے۔ یہ مباحثہ ساتھ ہی اس بات کی ایک مثال پیش کرتا ہے کہ ہم نفسیاتی قوانین اور مشینی نظام سے کیا معنی لیتے ہیں۔

''ساکن'' اور ''متحرک'' مطابقت میں فرق کرنا سودمند معلوم ہوتا ہے۔ ساکن مطابقت سے ہماری مراد کسی مثالی ترتیب سے ایسی مطابقت سے ہے جو کردار کی ساخت میں کوئی تبدیلی نہیں کرتی اور محض ایک نئی عادت اختیار کرنے کی دلیل ہوتی ہے۔ کھانا کھانے کا چینی طریقہ چھوڑ کر مغربی طرح چھری کانٹے سے کھانا شروع کرنا ایسی مطابقت کی ایک مثال ہے۔ امریکہ آنے والا چینی اس نئی مثالی ترتیب کے مطابق کھانا کھانے لگا گا؛ لیکن خود اس مطابقت کا اثر اس کی شخصیت پر کم پڑے گا؛ اس سے نئی خواہشیں یا مزاج میں نئے رنگ پیدا نہیں ہوتے۔

متحرک مطابقت سے ہمارا مطلب اس قسم کی مطابقت سے ہوتا ہے جو، مثلاً، اس وقت واقع ہوتی ہے جب ایک لڑکا سخت گیر اور دھمکانے والے باپ کے حک پر چلتا ہے (وہ اتنا ڈرتا ہے کہ اور کچھ کر ہی نہیں سکتا) اور ''اچھا'' لڑکا بن جاتا ہے۔ خود کو موقع کی ضروریات کے مطابق بناتے ہوئے اس کے اندر کچھ ہوتا ہے۔ ممکن ہے اس کے دل میں باپ کے لیے شدید دشمنی پیدا ہو جائے، جسے وہ دبائے رکھتا ہے کیونکہ اس کا اظہار یا محض اس سے آگاہی بہت خطرناک ثابت ہو سکی ہے۔ یہ دبی ہوئی دشمنی گو آشکارا نہیں، اس کے کردار کی ساحت میں ایک محرک عنصر ہے۔ اس سے ممکن ہے نی پریشانی ظہور میں آئے اور اسے زیادہ گہری اطاعت کی طرف لے جائے یا اس سے ایک مبہم تمرد کا آغاز ہو جو کسی خاص چیز کے نہیں، عام زندگی کے خلاف ہو۔ گو یہاں بھی، پہلی مثال کی طرح، فرد خود کو چند خارجی حالات کے مطابق بناتا ہے، اس قسم کی مطابقت اس میں ایک نئی چیز خلق کرتی ہے، نئی خواہشیں اور نئی پریشانیاں بیدار کرتی ہے۔ ہر اعضا بیت اس متحرک مطابق تکی مثال ہوتی ہے۔ دراصل یہ ایسے خارجی حالات (خصوصاً عنفوان طفلی کے حالات) کی مطابقت ہے، و بذاتِ خود خلافِ عقل ہوتے ہیں اور، عام الفاظ میں، بچے کے نشوونما اور بالیدگی کے لیے سازگار نہیں ہوتے۔ کسی طرح وہ معاشری نفسیاتی مظاہر جو اعصابی مظاہر کے ہم پلہ ہیں (اس پر آگے چل کر بات کی جائے گی کہ انہیں بھی اعصابی کیوں نہ کہا جائے) معاشری گروہوں میں طاقتور، تباہی خیز اور اذیت رساں تشویقوں کی موجودگی کی طرح، ایسے معاشری حالات سے مطابقت کی مثال ہیں جو انسان کی نشوونما کے لیے نقصان دہ اور نامعقول

ہیں۔

مطابقت کس قسم کی واقع ہوا کرتی ہے؟ اس سوال کے علاوہ دوسرے سوالوں کا جواب دینا بھی ضروری ہے، وہ کیا ہے جو آدمی کو زندگی کو فہم حالت کی مطابقت اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے اور آدمی کی مطابقت پذیری کی انتہا کیا ہے؟

ان سوالوں کا جواب دیتے ہوئے جس مظہر ہمیں پہلے بات کرنی ہے وہ یہ امر ہے کہ انسان کی فطرت کے چند اجزا باقی ہیں جن سے زیادہ لچکدار اور مطابقت پذیر ہیں۔ وہ کاوشیں اور کرار کے رنگ، جن کی بدولت ایک آدمی دوسرے سے مختلف ہوتا ہے بڑی افراط سے لچلچے پن اور تشکیل پذیری کا اظہار کرتے ہیں۔ محبت، تخریب کاری، اذیت رسانی، اطاعت کا رجحان، طاقت کی ہوس، بے تعلقی، خود پروری کی خواہش، کفایت شاعری کی لاگ، حظِ نفسانی سے لطف اندوزی اور نفس پرستی کا خوف۔ یہ اور بہت سی دیگر کاوشیں اور ڈر جو آدمیوں میں پائے جاتے ہیں۔ زندگی کے چند حالات کے ردِعمل کا نتیجہ ہیں۔ یہ سب کوئی خاص لچک دار نہیں، کیونکہ ایک دفعہ انسان کے کردار کا جزو بن جانے کے بعد آسانی سے ناپید یا کسی دوسری خواہش میں تبدیل نہیں ہوتے۔ لیکن وہ اس معنی میں لچکدار ہیں کہ افراد، بالخصوص بچپن میں، جس زندگی میں خود کو پاتے ہیں اسی کی پوری طرز کے مطابق اپنی اپنی ضرورتوں کو ترقی دیتے ہیں۔ ان ضرورت میں کوئی اتنی مثبوت اور بے لوچ نہیں کہ اس پر انسانی فطرت کے، جو ترقی کرتی ہے اور جسے ہر طرح کے حالات میں تسکین دینی پڑتی ہے، خلل جز رہوے کا گمان ہو۔

ان ضرورتوں کے مقابلے میں دوسری بھی ہیں۔ جو انسانی فطرت کا ناگزیر حصہ ہیں اور بالجبر تسکین چاہتی ہیں، یعنی وہ ضرورتیں جو انسان کی عضویاتی تنظیم میں اٹول ہیں، جسے بھوک، پیاس، سونے کی احتیاج وغیرہ۔ ان سب ضرورتوں کی ایک حد ہے، جس کے بعد ان کی کمی برداشت نہیں ہو سکتی اور جب وہ حد عبور ہو جائے تو ضرورت کی تسکین کا رجحان ایک انتہائی زور آور جہد کا جامہ پہن لیتا ہے ان تمام عضویاتی طور پر مشروط ضرورتوں کا حفظِ نفس کی ضرورت کے تصور میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے۔ حفظ نفس کی یہ ضرورت ان فطرت کا وہ حصہ ہے۔ جو ہر طرح کے حالات میں تسکین چاہتا ہے اور اس لیے انسانی طرزِ عمل کا بنیادی محرک ہے۔

اسی بات کے لیے سیدھا سادہ اصول وضع کر کے یوں کہہ سکتے ہیں: آدمی کے لیے کھانا، پینا، سونا، دشمنوں سے خود کو بچانا وغیرہ لازمی ہے۔ یہ سب کرنے کے لے ضروری ہے کہ وہ

کام کرے اور پیدا کرے۔ ''کام'' بہر حال کوئی عام یا مجرد چیز نہیں کام ہمیشہ ٹھوس کام ہوتا ہے، یعنی ایک نوعی قسم کے معاشیاتی نظام میں ایک نوعی قسم کا کام آدمی جاگیری نظام میں غلام، امریکی ہندی قریے میں کسان، سرمایہ دار معاشرے میں آزاد تاجر، جدید شعبہ جاتی دکان مس ی سیلز گرل، لمسی بڑے کارخانے کے رواں پٹے پر کاریگر کی حیثیت سے کام کرسکتا ہے۔ ان مختلف کاموں کو شخصیت کے بالکل ہی مختلف قسم کے مزاجوں کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ دوسروں سے مختلف قسم کے ارتباط کا باعث ہوتے ہیں۔ آدمی کے پیدا ہوتے ہی اس کے لیے اسٹیج تیار ہو جاتی ہے۔ اسے کھانا اور پینا ہے اور اس لیے کام بھی کرنا ہیا اور اسکا مطلب یہ ہے کہ وہ جس قسم کے معاشرے میں پیدا ہوا ہے اسی کے مخصوص حالات مس، اسی کے معین کردہ طریقوں سے اسے کام کرنا ہوگا۔ یہ دونوں عنصر، اس کے جینے کی ضرورت ار معاشری نظام، اصولاً بطور فرد اس کے لیے ناتغیر پذیر ہیں اور یہی وہ عنصر ہیں جو دوسری عادتوں کے نشو کا تعین کرتے ہیں جو زیادہ لوچ دار معلوم ہوتی ہیں۔

چنانچہ زندگی کا طرز، جیسا اسے ایک معاشیاتی نظام کی خصوصیت نے فرد کے لیے متعین کیا ہو، اس کے کردار کی تمم ساخت کو معین کرنے والا بنیادی عنصر بن جاتی ہے کیونکہ حفظِ نفس کی لابدی احتیاج اسے ان حالات کو قبول کرنے پر مجبور کر دیتی ہے جن میں وہ رہتا ہو۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ دوسرں سے مل کر چند معاشیاتی اور سیاسی تبدیلیاں وجود میں نہیں لاسکتا؛ لیکن بنیادی طور پر اس کی شخصیت تشکیل زندگی کے اسی مخصوص طرز سے ہوتی ہے جس سے وہ بچے کی حیثیت میں خاندان کی وساطت سے جوان تمام حصائص کی نمائندگی کرتا ہے جو کسی خاص معاشرے یا طبقے کی مثال ہوں، پہلے ہی دوچار ہو چکا ہو۔

انسان کی فطرت کا لابدی جز وصرف عضویاتی طور پر مشروط ضرورتیں نہیں۔ ایک اور جزو بھی ہے جو اتنا ہی لازمی ہے، جو جسمانی کمال میں نہیں، زندگی کے انسانی طرز اور معول کے جوہر میں اثول ہیں: اپنے سے باہر کی دنیا سے متعلق ہونے کی ضرورت، جو تنہائی سے بچنے کی ضرورت۔ بالکل تنہا اور علیحدہ محسوس کرنے کا نتیجہ ذہنی انتشار ہے، جیسے طبعی فاقہ کشی کا نتیجہ موت ہے۔ دوسروں سے یہ تعلق جسمانی اتصال سے مشابہ نہیں، ایک آدمی بہت حد تک جسمانی طور پر تنہا ہونے کے باوجود تصورات، اقدار یا اور کچھ نہیں تو معاشری مثال ترتیبوں سے متعلق رہ سکتا ہے، جن سے رفاقت اور ''کسی کا ہونے'' کا احساس ہوتا رہتا ہے۔ اس کے برعکس، لوگوں کے درمیان رہنے کے باوجود ممکن ہے کہ علیحدگی کا ایک شدید احساس اس پر غالب آجائے۔ جس کا

نتیجہ۔ اگر وہ ایک مقررہ حد سے تجاوز کر جائے، دیوانگی کی الت ہے جو ذہنی تشقیق سے پیدا ہونے والی واہمی کی آئینہ دار ہے۔

اقدار، علامتا اور مثلی ترقیبوں سے تعلق کے اس فقدان کو ہم اخلاقی تنہائی کا نام دے سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ اخلاقی تنہائی ہی نا قابلِ برداشت ہے جتنی کہ جسمانی تنہائی؛ بلہ جسمانی تنہائی برداشت کرنی اسی وقت محال ہوتی ہے جب وہ اخلاقی تنہائی کی غماز ہو۔ دنیا سے روحانی تعلق بہت سی شکلیں اختیار کر سکتا ہے؛ حجرے میں رہنے والا راہب، جو خدا پر یقین رکھتا ہے، اور سیاسی اسیر، جو علیحدہ رہ کر بھی اپنے ہم نبردوں کے ساتھ محسوس کرتا ہے، اخلاقی طور پر تنہا نہیں ہوتے۔ اور انتہئی بدیسی ماحول میں ڈنر جیکٹ پہننے والا انگیز صاحب در حقیر بورژوا بھی تنہا نہیں، جو ہم جنسوں سے گہری طرح علیحدہ ہونے کے باوجود، اپنی قوم یا اس کی علامات سے خود کو وابستہ محسوس کرتا ہے۔ دنیا سے تعلق کی قسم اعلیٰ بھی ہو سکتی ہے اور ادنیٰ بھی، لیکن اسفل ترین مثالی ترتیپس ے متعلق ہونا بھی تنہا ہونے سے بدر جہا قابل قبول ہے۔ رہب اور قومیت، اور ساتھ ہی وہ رسم اور اعتقاد جو، خواہ وہ کتنے ہی مہمل اور زبوں ہوں، افراد کو ایک دوسرے سے متعلق کرتے ہیں، اس چیز سے پناہیں ہیں جس سے آدمی سب سے زیادہ خوف کھاتا ہے: تنہائی۔

اخلاقی تنہائی سے بچنے کی سخت احتیاج وک بالزاک نے ''موجد کے آلام'' کی اس عبارت میں بہت موثر طرح بیان ہے:

''لیکن ایک بات سیکھ لو، اپنے ذہن پر ثبت کر لو جو ابھی تنا اثر پذیر ہے: آدمی کو تنہائی سے دہشت ہوتی ہے۔ اور تنہائی کو تمام اقسام میں اخلاقی تنہائی سب سے زیادہ مہیب ہے۔ اولین عزلتی خدا کے ساتھ رہتے ہیں؛ وہ اس دنیا کے مکیں تھے جو سب سے زیادہ آباد ہے، ارواح کی دنیا۔ انسان کا پہلا خیال، خواہ وہ کوڑھی ہو یا زندانی، گناہگار ہو یا اپاہج، یہ ہوتا ہے: کوئی میرے مقدر کا ساتھی ہو۔ اس خواہش کو، جو بذاتِ خود زندگی ہے، تسکیں پہنچانے کے لیے وہ اپنی ایڑھی چوٹی کا زور لگا دیتا ہے، اپنی تمام ... اور پوری زندگی کی توانائی صرف کر ڈالتا ہے۔ اس بے بس کر دینے والی لگن کے بغیر کیا شیطان کو ساتھی مل سکتے تھے؟ کوئی ہے تو اس موضوع پر پورا رزمیہ لکھ سکتا ہیجو ''فردوس گم گستہ'' کی تمہید ہوگا، کیونکہ ''فردوسِ گم گشتہ'' بغاوت کے اعتذار کے وا کچھ نہیں۔''

آدمی میں تنہائی کا خوف اتنا پر زور کیوں ہے؟ اس سوال کا جواب دینے کی کوشش

ہمیں اس شاہراہ سے جس پر ہم چل رہے ہیں بہت دور لے جائے گی۔ بہر حال، میں قاری پر یہ تاثر پیدا کرنا نہیں چاہتا کہ دوسروں کے ساتھ رہنے کے احساس کی ضرورت کسی پراسرار وصف کی حامل ہے، میں مجملاً یہ بتانا پسند کروں گا کہ میرے خیال میں اس کا جواب کس پہلو سے مل سکتا ہے۔

ایک عنصر ہے یہ امر کہ آدمی دوسروں سے کس قسم کے تعاون کے بغیر جی نہیں سکتا۔ کلچر کی کوئی قابل تصور قسم ہو، آدمی اس میں اگر سلامت رہنا چاہتا ہے تو دوسروں سے تعاون کرنا ضروری ہے، خواہ اس کا مقصد خود کو دشمنوں یا فطرت کے مخاطروں سے بچانا ہو یا وہ کام اور پیداوار کا وقع چاہتا ہو۔ رابنسن کروسو تک کے ساتھ فرائیڈے خادم تھا؛ اس کے بغیر وہ غالباً نہ صرف پاگل ہو جاتا بلکہ سچ مچ مر جاتا۔ دوسروں کی مدد کی اس ضرورت کا ہر آدمی کو بطورِ طفل بہت شدت سے تجربہ ہوتا ہے۔ جہاں تک اہم ترین جسمانی اعمال کا تعلق ہے انسانی بچہ اپنا خیال نہیں رکھ سکتا۔ اس واقعی معذوری کی وجہ سے دوسروں سے رابطہ اسکے لیے زندگی اور موت کا سوال ہوتا ہے۔ اکیلے رہ جانے کا امکان، لازمی طور پر، بچے کے کل وجود کو سب سے سنگین تخویف ہے۔

بہر حال ایک عنصر اور بھی ہے جو ''کسی کا ہونے'' کی ضرورت کو لازمی بنا دیتا ہے: داخلی خود آگاہی کا، سوچنے کی صلاحیت کا امر، جس سے آدمی کو اپنے انفرادی ہستی یعنی فطرت اور دوسرے لوگوں سے مختلف ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ گو اس آگاہی کے مدارج کہیں کم اور کہیں زیادہ ہوتے ہیں مگر اس کا وجود آدمی کے سامنے ایک مسئلہ لے آتا ہے جو بالذات انسانی ہے: اس سے آگاہ ہو کر کہ وہ فطرت اور دوسرے لوگوں سے مختلف ہے، بیماری اور موت اور بڑھاپے سے، بہت مبہم طور پر سہی، آشنا ہو کر وہ لازماً کائنات اور باقی لووں کے مقابلے میں جو ''وہ'' نہیں ہیں اپنی، ہیچ کسی اور کمتر ینی محسوس کرتا ہے۔ اگر وہ کسی سے متعلق نہ ہو، اگر اس کی زندگی معنی اور نہج سے محروم ہو تو وہ خاک کے ذرے کی مانند محسوس کرے گا اور اپنی انفرادی بے مائیگی سے مغلوب ہو جائے گا۔ وہ خود کو کسی ایسے نظام سے وابستہ نہ کر سکے گا جو اس کی زندگی کو معنی اور نہج عطا کر سکے؛ وہ شک میں ڈوبا رہے گا ارشک آخر کار اسی کی فعلیت یعنی جینے کی صلاحیت کو مفلوج کر دے گا۔

○

(ترجمہ: محمد سلیم الرحمٰن)

سویرا، لاہور، نمبر 26

کیرن آرمسٹرانگ

اسطور کیا ہے ؟

اسطوسازی بنی نوع انسان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ آثاریات کے ماہروں کو نینڈر تھال (حجری دور کے انسان کا ڈھانچہ) کی قبروں کی کھدائی کے دوران میں ایسے ہتھیار، آلات اور قربانی کے جانوروں کی ہڈیاں ملی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ (نینڈر تھال) اپنی موجودہ زندگی سے ملتی جلتی آئندہ کی زندگی پر اعتقاد رکھتے تھے۔ نینڈر تھال نے ایک دوسرے کو اس زندگی سے متعلق کہانیاں سنائی ہوں گی جوان کے مرے ہوئے ساتھی بسر کر رہے ہوں گے۔ وہ یقیناً موت سے متعلق ایک ایسے انداز میں سوچتے ہوں گے جوان کے ساتھ رس بس رہی مخلوقات نے اختیار نہیں کیا۔ جانور ایک دوسرے کو مرے ہوئے دیکھتے ہیں، مگر جہاں تک ہمیں معلوم ہے، وہ اس پر مزید کوئی توجہ نہیں دیتے، لیکن نینڈر تھال کی قبریں ظاہر کرتی ہیں کہ جب ان ابتدائی انسانوں کو اپنی فنا پذیری کا ادراک ہوا تو انھوں نے اس سے مصالحت کرنے کی غرض سے ایک طرح کا متبادل بیانیہ خلق کر لیا۔ نینڈر تھال جس احتیاط سے اپنے ساتھیوں کو دفن کرتے تھے، اس سے لگتا ہے کہ وہ مرئی دنیا ہی کو واحد حقیقت خیال نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ انسانی تاریخ کے بالکل ابتدائی عہد ہی سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ نوع انسانی کا (دیگر مخلوقات کے مقابلے میں) امتیاز ہی یہ ہے کہ وہ روزمرہ تجربے سے ماورا خیالات قائم کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

ہم معنی کی جستجو کرنے والی مخلوق ہیں۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے، کتے، سگانہ صورت حال سے متعلق آزار محسوس نہیں کرتے، نہ دنیا کے دوسرے حصوں میں اپنی نوع کی کسمپرسی سے پریشان ہوتے ہیں اور نہ ہی اپنی زندگیوں کو ایک مختلف تناظر میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن انسان جلد مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہم نے بالکل ابتدا ہی میں ایسی کہانیاں گھڑیں جن سے ہم

زندگی کو ایک بڑے منظر نامے میں سمجھنے کے قابل ہو سکے۔ یہ کہانیاں (اشیا و مظاہر کی) زیریں تنظیم کو منکشف کرتی تھیں اور ہمیں احساس دلاتی تھیں کہ ہر طرح کی مایوسی اور بکھراؤ کے ہوتے ہوئے زندگی معنی اور قدر و منزلت رکھتی ہے۔

انسانی ذہن کی ایک اور امتیازی خصوصیت، ایسے خیالات اور تجربات کا حامل ہونا ہے جن کی عقلی توجیہہ نہیں کی جا سکتی۔ ہم تخیل کے نام سے ایک ایسی صلاحیت رکھتے ہیں جو ہمیں کسی ایسی چیز کا خیال کرنے کے قابل بناتی ہے جو فی الوقت ہمارے سامنے موجود نہیں ہوتی اور جب ہم اسے پہلی مرتبہ تصور میں لاتے ہیں تو اس کا کوئی معروضی وجود نہیں ہوتا۔ یہ تخیل کی صلاحیت ہی ہے جس نے مذہب اور اساطیر کو پیدا کیا ہے۔ ہمارے زمانے میں اسطوری فکر کی ساکھ باقی نہیں رہی۔ ہم اکثر اسے غیر عقلی اور مبالغہ آمیز سمجھ کر مسترد کر دیتے ہیں۔ لیکن تخیل ہی وہ صلاحیت ہے جس نے سائنس دانوں کو نیا علم منظر عام پر لانے اور نئی ٹیکنالوجی ایجاد کرنے کے قابل بنایا ہے جس نے ہمیں بے حساب طور پر ذی اثر بنایا ہے۔ سائنس دانوں کے تخیل سے ہم اوپر خلا میں سفر کرنے اور چاند پر چہل قدمی کے قابل بھی ہوئے ہیں اور یہ کارنامے کبھی اساطیری دنیا میں ہی ممکن تھے۔ اساطیر اور سائنس دونوں سے نوع انسانی کا مطمح نظر وسیع ہوا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی مانند اساطیر (جیسا کہ ہم آگے بحث کریں گے) اس دنیا سے خود کو الگ کرنے سے متعلق نہیں بلکہ اس کے اندر زیادہ ذی الحس ہو کر جینے کے قابل بنانے سے متعلق ہے۔

نینڈرتھال کی قبروں سے اسطور کے بارے میں پانچ اہم باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ اوّل: اسطور کی بنیاد تقریباً ہمیشہ موت کے تجربے اور فنا کے خوف پر ہوتی ہے۔ دوم: جانوروں کی ہڈیاں ظاہر کرتی ہیں کہ قربانی سمیت [مُردوں کی] تدفین ہوا کرتی تھی۔ رسوم کو اساطیر سے بالعموم الگ نہیں کیا جاتا۔ بہت سی اساطیر کا اس اجتماعی عبادتی تمثیل سے ہٹ کر کوئی مفہوم نہیں ہوتا جو انھیں زندہ کر دیتی ہے، نیز یہ اساطیر غیر مذہبی فضا میں ناقابل فہم ہوتی ہیں۔ سوم: نینڈرتھال کی اسطور ایک طرح سے قبر جو زندگی کی انتہا ہے، اس کے پہلو میں دہرائی جاتی تھی۔ انتہائی پر اثر اساطیر حد انتہا سے متعلق ہیں، یعنی وہ ہمیں اپنے تجربے کو عبور کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ ہماری زندگی میں بعض مواقع ایسے آتے ہیں جب ہمیں ایک طرح سے یا دوسری طرح سے، کسی ایسی جگہ پر جانا پڑتا ہے جسے پہلے کبھی نہیں دیکھا ہوتا اور وہ کچھ کرنا پڑتا ہے جو پہلے کبھی نہیں کیا ہوتا۔ اسطور نامعلوم سے متعلق ہے، یہ اس شے کے بارے میں ہے جسے ہم ابتدائی لفظوں میں بیان کرنے سے قاصر ہوتے

ہیں۔ چنانچہ اسطور کی تھاہ ایک غیر معمولی سکوت ہے۔ چہارم: اسطور، کہانی برائے کہانی نہیں ہے۔ یہ ہمیں زندگی کرنے کا ڈھنگ سکھاتی ہے۔ نینڈرتھال کی قبروں میں میت کو بعض اوقات جنینی (Foetal) حالت میں رکھا گیا ہے تاکہ دوسرا جنم لے سکے، تاہم مرحوم کو اگلا قدم تو خود ہی اٹھانا ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ اساطیر ہمیں اس یا آئندہ دنیا میں درست عمل کرنے کی غرض سے صحیح روحانی یا نفسیاتی بہاؤ میں لے جاتی ہیں۔

نینڈرتھال کی قبریں اسطور سے متعلق ہمیں پانچویں اور اہم بات یہ بتاتی ہیں کہ تمام اساطیر ایک دوسرے منطقے کی خبر دیتی ہیں مگر جو ہماری یعنی اِس دنیا سے ملحق ہے اور ایک طرح سے اسے سہارا دیے ہوئے ہے۔ وہ غیر مرئی مگر پر اثر حقیقت جسے بعض اوقات دیوتاؤں کی دنیا کہا جاتا ہے، اساطیر کا مرکزی موضوع ہے۔ اسے 'دائمی فلسفہ' کہا گیا ہے، کیوں کہ اس میں ہماری سائنسی جدیدیت کے آغاز سے پہلے کے تمام معاشروں کی دیومالا، رسوم اور معاشرتی تنظیم جاگزیں ہیں اور آج بھی بیشتر روایتی معاشرے اس سے اثر قبول کیے چلے جا رہے ہیں۔ اس 'دائمی فلسفے' کے مطابق جو کچھ ہماری دنیا میں واقع ہوتا ہے، جو ہم سنتے اور دیکھتے ہیں، اس کی زیریں سطح پر اس کا مثیل الوہی مملکت میں موجود ہوتا ہے، جو ہماری دنیا سے زیادہ دلفریب، زبردست اور دیرپا ہے (۱)۔ لہٰذا ہر مادی حقیقت اس آرکی ٹائپ کا دھندلا سایہ ہے، یعنی ایک اصلی مثالی نمونے کی ناقص نقل ہے۔ اس الوہی زندگی میں شامل ہو کر ہی فانی، بودے انسان اپنے خوابیدہ جوہر (سے آگاہ اور اس) کی تکمیل کر سکتے ہیں۔ اساطیر نے اسی حقیقت کو ایک قطعی شکل اور ہیئت دی ہے، جسے لوگوں نے وہبی طور پر محسوس کیا۔ اساطیر نے لوگوں کو سمجھایا کہ دیوتاؤں کا رنگ ڈھنگ کیا ہے، تاہم واضح رہے کہ یہ نہ تو بے کار تجسس کی پیداوار ہیں نہ یہ تفریحی کہانیاں ہیں، بلکہ مردوں اور عورتوں کو ان طاقت ور ہستیوں کے نقش قدم پر چلنا اور الوہیت کا خود تجربہ کرنا سکھاتی ہیں۔

ہم اپنی سائنسی ثقافت کے زیر اثر الوہی ہستی کے عموماً بڑے سادہ لوح تصورات رکھتے ہیں۔ قدیم دنیا میں 'دیوتاؤں' کو شاید ہی ایسی مافوق الفطرت ہستیاں سمجھا گیا ہو جو متمیز شخصیتیں رکھتے ہوں اور یکسر الگ تھلگ مابعد الطبیعیاتی زندگی بسر کرتے ہوں۔ اساطیریات جدید مفہوم میں دینیات کے متعلق نہیں تھی، بلکہ انسانی تجربے سے متعلق تھی۔ لوگ سوچتے تھے کہ دیوتا، انسان، جانور، فطرت اٹوٹ بندھن میں بندھے تھے؛ یکساں قوانین کے پابند تھے اور ان کا خمیر یکساں الوہی جوہر سے اٹھا تھا۔ ابتدا میں دیوتاؤں کی دنیا اور مردوں، عورتوں کی دنیا میں وجود پاتی خلیج

نہیں تھی۔ جب لوگ الوہی ہستی کے بارے میں بات چیت کرتے تھے تو وہ عموماً دنیاوی حقیقت ہی کے ایک پہلو کو معرض گفتگو میں لا رہے ہوتے تھے۔ دیوتاؤں کے وجود کو طوفان، سمندر، دریا یا محبت، غصے، جنس کے ان طاقتور انسانی جذبات سے جدا کرنا ناممکن نہیں تھا جو مردوں اور عورتوں کو وقتی طور پر ایک مختلف قلمرو میں پہنچا دیتے تھے تاکہ وہ دنیا کو نئی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔

ان مفروضات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اساطیر اس لیے وضع کی گئیں کہ وہ غیر یقینی انسانی صورت حال سے نپٹنے میں ہماری مدد کریں۔ اساطیر نے دنیا میں اپنا منصب و مقام دریافت کرنے اور اپنی حقیقی منزل متعین کرنے میں لوگوں کی مدد کی۔ ہم سب جاننا چاہتے ہیں کہ ہم کہاں سے آئے، مگر چونکہ ہماری انتہائی شروعات قبل تاریخ کی دھند میں گم ہو چکی ہیں، اس لیے ہم نے اپنے آبا و اجداد کے بارے میں دیومالائیں تخلیق کیں جو ہر چند تاریخی نہیں ہیں، مگر وہ ہمارے ماحول، ہمسایوں اور رواجوں سے متعلق ہمارے موجودہ رویوں کو سمجھنے میں ہماری دست گیری کرتی ہیں۔ ہم یہ بھی جاننا چاہتے ہیں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں، اس لیے ہم نے ایسی کہانیاں گھڑی ہیں جو ہماری بعد از مرگ زندگی کے بارے میں ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ (جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے) ایسی اساطیر کی تعداد زیادہ نہیں جو بنی نوع انسان کی لافانیت کا تصور پیش کرتی ہوں۔ نیز ہم ان ارتقاعی لمحات کی توجیہہ کرنا بھی چاہتے ہیں، جب ہمیں لگتا ہے کہ ہم اپنے روزمرہ جھمیلوں سے ماورا ہو رہے ہیں۔ دیوتاؤں نے ماورائیت کے تجربے کی توجیہہ کرنے میں [بھی] ہمیں مدد دی ہے۔ یہ دائمی فلسفہ ہماری اس باطنی حس کا اظہار کرتا ہے کہ جو کچھ ہمیں دکھائی دیتا ہے، اس سب سے سوا اور پرے، بنی نوع انسان اور مادی دنیا کے لیے بہت کچھ موجود ہے۔

آج کل لفظ 'اسطورہ' سے عام طور پر ایک ایسی چیز مراد لی جاتی ہے جو مطلق سچ نہ ہو۔ کوئی سیاست دان، جس پر معمولی خطا کا الزام ہو، کہے گا کہ یہ ایک 'اسطورہ' (متھ) ہے، ایسا کچھ بھی واقع نہیں ہوا۔ جب ہم سنتے ہیں کہ دیوتا زمین پر چل رہے ہیں، مردے مقبروں سے باہر آ کر ڈگ بھر رہے ہیں یا سمندر معجزانہ طور پر پھاڑے جا رہے ہیں تاکہ اپنے پیاروں کو دشمنوں سے بچایا جا سکے تو ہم ان کہانیوں کو ناقابل یقین اور صریحاً غیر حقیقی قرار دے کر مسترد کر دیتے ہیں۔ ہم نے اٹھارویں صدی سے سائنسی زاویۂ نظر پیدا کر لیا ہے۔ لہٰذا ہمارا سروکار سب سے بڑھ کر اس بات سے ہے کہ واقعتاً کیا رونما ہوا۔ لیکن قبل جدید دنیا میں جب لوگ ماضی کے بارے میں خامہ فرسائی کرتے تھے تو ان کا سروکار اس بات سے ہوتا تھا کہ ایک واقعے کا معنی و مفہوم کیا تھا۔ ایک اسطورہ

ایک واقعہ تھی جو ایک لحاظ سے، ایک ہی مرتبہ پیش آیا مگر جو ہمیشہ بھی پیش آتا رہا۔ چوں کہ ہم تاریخ کا واقعاتی ترتیب سے ہٹ کر کوئی تصور ہی نہیں کر سکتے، اس لیے مذکورہ اساطیری واقعے کے لیے ہمارے پاس کوئی لفظ نہیں۔ اصل یہ ہے کہ اساطیر آرٹ کی ایک قسم ہے جو ہمیں انسانی وجود کے اس لازمانی عنصر کی طرف متوجہ کرتی ہے جو تاریخ سے ماورا ہے، اس کی مدد سے ہم بے ترتیب واقعات کے غیر منظم سیلان سے اوپر اٹھ کر حقیقت کے مرکزے کی جھلک پا سکتے ہیں۔

ماورائیت کا تجربہ، انسانی تجربے کا ہمیشہ حصہ رہا ہے۔ جب کوئی شے ہمارے دل کے تار چھو لیتی ہے اور ہم لمحاتی طور پر خود کو اپنے آپ سے بلند ہوتا محسوس کرتے ہیں تو یہ ہمارے لیے وجد و سرمستی کی حالت ہوتی ہے۔ ایسے لمحات میں ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہم معمول سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ جی رہے ہیں، اپنے جملہ امکانات کو بروئے کار لا رہے ہیں اور ہم اس منطقے میں سانس لینے لگے ہیں جو ہماری کل انسانیت کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ مذہب، وجد حاصل کرنے کے، بیشتر روایتی ذرائع میں سے ایک رہا ہے، لیکن اگر لوگوں کو اب یہ مندروں، کنیسوں، گرجوں یا مسجدوں میں نہیں ملتا تو وہ اسے کہیں اور تلاش کرتے ہیں، مثلاً آرٹ، موسیقی، شاعری، عوامی گیتوں، رقص، منشیات، جنس یا کھیلوں میں۔ شاعری اور موسیقی کی مانند، اساطیر کو ہمارے اندر ایک عالم کیف کو بیدار کرنا چاہیے، اس حقیقت کے باوصف کہ موت ناگزیر ہے اور اپنے نیست و نابود ہونے کے آثار دیکھتے ہی ہم پر حرماں کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ اگر ایک اسطورہ یہ سب نہیں کر سکتی تو سمجھ لیجیے کہ اس پر مُردنی چھا چکی اور اپنی افادیت کھو چکی ہے۔

بنا بریں اسطور کو ایک ادنیٰ طرز فکر خیال کرنا غلطی ہے، اس لیے اسے یہ سوچ کر ترک کرنا بھی غلط ہے کہ نوع انسانی عقل کے عہد میں داخل ہو چکی ہے۔ اساطیر ان ابتدائی کوششوں میں شامل نہیں جو تاریخ کے سلسلے میں کی گئیں اور نہ ہی انھیں یہ دعویٰ ہے کہ ان کی کہانیاں معروضی حقیقت ہیں۔ ناول، غنائی تمثیل یا سنگیت ناچ کی مانند ہی، اسطور بھی واہمے پر مبنی ہے۔ یہ ایک ایسا کھیل ہے، جو ہماری پارہ پارہ المیہ دنیا کو ارفع و مثالی صورت دیتا ہے اور یہ سوال اٹھا کر نئے امکانات کی جھلک پانے میں ہماری مدد کرتا ہے کہ ''اگر ایسا ہو تو کیا فرق پڑے گا؟''... ظاہر ہے یہ ایک ایسا سوال ہے جس کے نتیجے میں فلسفے، سائنس اور ٹیکنالوجی میں بعض انتہائی اہم دریافتیں سامنے آتی ہیں۔ عینڈرتھال اپنے مردہ ساتھیوں کو ایک نئی زندگی کے لیے تیار کرتے ہوئے، غالباً روحانی واہمے کے اسی کھیل میں مشغول ہوئے تھے جو تمام اسطور تشکیل دینے والوں میں مشترک

ہے: ''اگر یہ دنیا اسی طرح وہاں نہ ہوئی تو کیا ہوگا؟ یہ بات کس طور ہمیں نفسیاتی، عملی یا سماجی اعتبار سے متاثر کرے گی؟ کیا ہم مختلف (وجود) بن جائیں گے؟ زیادہ مکمل؟ اور اگر ہمیں یہ پتہ چلے کہ ہماری قلب ماہیت ہوگئی تو کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوگا کہ ہمارا اسطوری اعتقاد ایک لحاظ سے سچا تھا جو ہمیں ہماری انسانیت سے متعلق کوئی اہم نکتہ سمجھا رہا تھا، خواہ ہم اسے عقلی طور پر ثابت نہ کرسکیں؟'' نوع انسانی کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ اس نے کھیل و ناٹک کی صلاحیت برقرار رکھی ہے۔ (۲) دوسرے جانور جنگل کی زندگی کی تلخ حقیقتوں کا سامنا کرتے ہی کھیل و تفریح کے ابتدائی احساس سے محروم ہوجاتے ہیں، سوائے اس کے کہ وہ قید کے مصنوعی حالات میں جی رہے ہوں۔ تاہم بالغ انسان مختلف امکانات سے ساتھ شوخی و دل لگی کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں اور ہم سب بچوں کی طرح تخیلاتی دنیاؤں کی تخلیق کرتے رہے ہیں۔ آرٹ میں ہم عقل و منطق کی بندشوں سے آزاد ہوکر، نئی ہیئتوں کو تصور اور متحد کرتے ہیں، جن سے ہماری زندگیوں میں بہتری آئی ہے اور جن کے بارے میں ہمیں یقین ہے کہ وہ ہمیں کچھ اہم اور بدرجہ غایت سچی باتوں کی تعلیم دیتی ہیں۔ اساطیر میں بھی ہم ایک مفروضہ زیر غور لاتے ہیں، رسوم کے ذریعے اسے زندگی کے قریب لاتے ہیں، اس پر عمل کرتے ہیں، اپنی زندگیوں پر اس کے اثرات دھیان میں لاتے ہیں اور اس سب کے نتیجے میں ہم پر منکشف ہوتا ہے کہ اپنی دنیا کے پریشان کن معمے کے لیے ہم نے ایک نئی بصیرت حاصل کرلی ہے۔

لہٰذا ایک اسطور اس بنا پر سچی ہے کہ یہ مؤثر ہے، نہ کہ اس بنا پر کہ یہ ہمیں واقعاتی معلومات دیتی ہے۔ تاہم اگر یہ زندگی کے گہرے معنی کے سلسلے میں ہمیں نئی بصیرت عطا کرنے سے قاصر رہتی ہے تو اس کی ناکامی یقینی ہے۔ اگر یہ اثر کرتی ہے، یعنی یہ ہمارے ذہنوں اور دلوں کو بدلنے کی تحریک دیتی ہے، ہمیں نئی امیدیں دیتی ہے اور ہمیں مزید بھرپور طریقے سے زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتی ہے تو یہ ایک معقول اسطورہ ہے۔ اساطیر صرف اسی وقت ہمیں ایک ارفع تبدیلی سے ہم کنار کریں گی جب ہم ان کی ہدایات کی پیروی کریں گے۔ ایک اسطورہ اپنی اصل میں ایک رہبر ہے۔ یہ ہمیں سکھاتی ہے کہ زیادہ بہتر زندگی بسر کرنے کے لیے ہمیں لازماً کیا کرنا چاہیے۔ اگر ہم اسطور کا اطلاق خود اپنی صورت حال پر نہیں کرتے اور اسے اپنی زندگیوں کی ایک حقیقت نہیں بناتے تو یہ اسی طرح ناقابل فہم اور بعید رہے گی جس طرح تختے پر کھیلی جانے والی بازی کے اصول ہمیں تب تک پریشان اور بے زار کرنے والے لگتے ہیں جب تک ہم (انھیں سمجھ

کر) کھیلنا شروع نہیں کرتے۔

اسطور سے ہم کس قدر بیگانہ ہو چکے ہیں، اس کی کوئی مثال پہلے نہیں ملتی۔ قبل جدید دنیا میں اساطیر ناگزیر تھیں۔ ان کی مدد سے نہ صرف لوگوں نے اپنی زندگیوں کا مفہوم سمجھا، بلکہ انسانی ذہن کے وہ علاقے بھی منکشف ہوئے، دوسری صورت میں جن تک رسائی محال تھی۔ اسطورہ، نفسیات کی ابتدائی صورت تھی۔ دیوتاؤں اور سورماؤں کی کہانیاں جو تاریک دنیا میں واقع ہوتی، بھول بھلیوں میں راستہ بناتی، راکشسوں سے نبرد آزما ہوتی ہیں، سائیکی کی پراسرار کارکردگی منظر عام پر لاتی ہیں اور لوگوں پر یہ بات افشا کرتی ہیں کہ وہ اپنے داخلی بحرانوں کا کیوں کر سامنا کریں۔ جب فرائیڈ اور ژونگ نے جدید انسان کی روح کی جستجو کا خاکہ کھینچنا شروع کیا تو وہ اپنی بصیرتوں کی توجیہہ کے لیے کلاسیکی اساطیر کی طرف جبلی طور پر متوجہ ہوئے اور پرانی دیومالاؤں کی ایک نئی تعبیر پیش کی۔

اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہ تھی۔ اسطور کا کوئی واحد، کٹر روایتی متن کبھی موجود نہیں رہا۔ حالات کی تبدیلی کے ساتھ ہی ہمیں اپنی کہانیوں کو مختلف انداز میں بیان کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے، تاکہ ہم ان کی لازمی سچائی کو سامنے لاسکیں۔ اساطیر کی اس مختصر تاریخ میں ہم اس امر کا جائزہ لیں گے کہ کس طرح ہر مرتبہ مردوں اور عورتوں نے جرات مندانہ قدم اٹھاتے ہوئے اپنی اساطیر پر نظر ثانی کی اور انھیں نئی صورت حال کے مطابق ڈھالا۔ علاوہ بریں ہم یہ بھی جانیں گے کہ انسانی فطرت کچھ زیادہ تبدیل نہیں ہوئی اور ان میں سے بہت سی اساطیر آج بھی ہمارے بنیادی اندیشوں اور آرزوؤں کو موضوع بناتی ہیں۔ اس لیے کہ ان کی تخلیق ان معاشروں میں ہوئی جو ہمارے معاشروں سے زیادہ مختلف نہیں تھے۔

(ترجمہ ناصر عباس نیر)

○

سرورالہدیٰ

درد کی رات گزر جائے تو سو جاؤں گا

(خلیل مامون کی یاد میں)

خلیل مامون صاحب نے صرف ایک مرتبہ دنیا سے گزر جانے کا ذکر کیا تھا۔ اپنی صحت کے بارے میں کچھ بتاتے ہوئے کہنے لگے کہ اتنے سال کا ہو گیا ہوں، یہ عمر بھی اچھی خاصی ہوتی ہے۔ نہ کوئی گھبراہٹ تھی اور نہ کوئی ملال تھا۔ بہت سی دوسری باتوں کے ساتھ موت کا ذکر معمول کا ذکر معلوم ہوا تھا۔ 'کیا کرنا ہے'، 'کیا رکھا ہے'، 'ٹھیک ہے' یہ کچھ ایسے جملے اور الفاظ ہیں جو عام طور پر وہ گفتگو میں استعمال کرتے تھے۔ انگریزی کا 'کریکٹ' اور 'رائٹ' یہ دو الفاظ بھی گفتگو کا حصہ تھے۔ مجھے ہمیشہ محسوس ہوا کہ وہ اپنے بارے میں زیادہ سوچتے نہیں ہیں۔ اگرچہ صحت کے سلسلے میں بہت حساس تھے۔ مستقل طور پر یونانی اور ہومیوپیتھی کی دوائیں استعمال کرتے۔ اپنی تکلیف کے بارے میں کبھی کبھی بتاتے۔ پاؤں کی ایک انگلی کا آپریشن ہوا تھا، یا اس میں شدید تکلیف تھی، اور باتوں کا ذکر کرتے ہوئے سرسری طور پر آپریشن کا ذکر کیا۔ پچھلے سے پچھلے برس غالب انسٹی ٹیوٹ نے غالب سے متعلق بنگلور میں ایک سمینار کا انعقاد کیا تھا۔ کلیدی خطبہ خلیل مامون صاحب کا تھا۔ بہت تیاری کے ساتھ جلسے میں شریک ہوئے۔ یہ میری ان سے دوسری ملاقات تھی۔ پہلی ملاقات دہلی میں ہوئی۔ انہیں کسی بزرگ کے مزار پر جانا تھا۔ ایک ایسا مقام طے ہوا جہاں ان سے ملاقات ہو سکے، اور پھر وہ اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جائیں۔ پہلی ملاقات میں ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کئی ملاقاتیں ہو چکی ہوں۔ ان کی شخصیت کا اپنا ایک رعب تھا۔ مگر ان سے مل کر اور بات کر کے محسوس نہیں ہوا کہ انہیں اپنے اس مرتبہ کا احساس ہے جو عام طور پر لوگوں کو مضحکہ خیز بنا دیتا ہے۔ ان کی شخصیت میں خوش لباسی اور خوش گفتاری دونوں کا اہم کردار ہے۔ ایک اور ملاقات کا خیال آتا ہے، ساہتیہ اکیڈمی میں ان کی کتاب پر مذاکرہ تھا، گوپی چند نارنگ صاحب کی صدارت تھی، مجھے

بھی اس موقع پر کچھ کہنا تھا۔ خلیل مامون صاحب کی تین نظموں کو پڑھ کر سنایا تھا اور انہی کے حوالے سے بات چیت کی فضا ہموار ہوگئی تھی۔ اس موقع پر انہوں نے اپنے بارے میں کچھ کہنے سے گریز کیا تھا۔ مجھے یاد نہیں آتا کہ کبھی انہوں نے اپنی شاعری یا اپنی نثر کے بارے میں مجھ سے کوئی گفتگو کی ہو یا فرمائش۔ وہ اپنی کتابیں بھیج دیتے اور پھر بے نیاز ہو جاتے۔ یہ ادا بہت کم لوگوں کے یہاں باقی رہ گئی ہے۔ ایک مرتبہ خوشگوار موڈ میں مجھ سے فون پر کہنے لگے کہ ''سرور یہ بتایئے کہ کس کو کتاب نہ بھیجی جائے؟'' میرا جواب تھا کہ آپ پہلے کتابیں انہیں بھیج دیجئے جنہیں بھیجی جانی چاہئیں۔ پھر گفتگو اسی موضوع پر آگے بڑھتی گئی۔ کتابوں کے سلسلے میں ان کا تجربہ بہت ناخوشگوار تھا۔ کہتے تھے کہ ضروری نہیں ہے کہ آپ جسے کتاب بھیجیں وہ کتاب دیکھے بھی۔ لیکن وہ لازماً اپنے پاس آنے والی کتابوں کو پڑھتے تھے اور مجھ سے کبھی کبھی گفتگو بھی کرتے۔ دیکھیے کیا لکھا ہے کیسا لکھا ہے۔ ان کی مشکل یہ تھی کہ آسانی سے انہیں کوئی کتاب پسند نہیں آتی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہرگز نہیں کہ ان کا کوئی تعصب تھا بلکہ وہ شاعری ہو یا فکشن یا تنقید دوسری زبانوں کے ادب سے حوالہ دیتے اور کہتے کہ دیکھیے لوگ اس طرح سوچتے نہیں ہیں۔ مغربی ادب کا مطالعہ یہ فقرہ رسمی و رواجی سا بن گیا ہے ہر ایک کے بارے میں آسانی سے کہہ دیا جاتا ہے۔ مگر ہم یہ نہیں سوچتے کہ جس مغربی ادب کے مطالعے کو کسی سے منسوب کیا جا رہا ہے، اس کی سمجھ اور بصیرت کیا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ لوگ صرف ناموں اور کتابوں کا حوالہ دے کر سمجھتے ہیں کہ بات بن گئی۔ بات بن بھی جاتی ہے مگر محض اطلاعاتی ذہن خود کو اور دوسروں کو علمی اور فکری طور پر آسودہ نہیں کر سکتا۔ الگ الگ وقتوں میں جو ان سے گفتگوئیں ہوئی ہیں، وہ میرے مطالعے کے تعلق سے بہت اہم ہیں۔ وہ اکثر کسی کتاب کا ذکر کرتے اور بہت خوبصورتی کے ساتھ یہ معلوم کر لیتے کہ وہ کتاب میں نے پڑھی ہے یا نہیں پڑھی ہے۔ وہ نئی سے نئی اور پرانی سے پرانی کتابوں کا ذکر کرتے ہوئے بہت کم عجلت سے کام لیتے۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا یہ کہنا پڑا کہ ابھی میں آپ کو کال کرتا ہوں۔ یہ بھی ان کی شخصیت کا ایک اہم پہلو ہے کہ انہوں نے کبھی اس بات کا برا نہیں مانا کہ میں تھوڑی دیر میں آپ سے بات کروں گا۔ وہ اس معاملے میں بہت عملی تھے اور سمجھ جاتے تھے کہ کوئی مصروفیت ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ کئی دن ہو گئے اور کال بیک نہیں کیا۔ پھر جب بات ہوتی تو ذکر بھی نہیں آتا تھا کہ انہوں نے فون کیا ہے۔ مجھ سے وہ علمی اور ادبی طور پر اتنا کام لینا چاہتے تھے کہ میں خوش ہونے کے ساتھ ساتھ گھبرا جاتا تھا۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ میں کتابوں کے ترجمے بھی کروں۔ ان میں ایک کتاب

سوسان سونتج کی اگینسٹ انٹرپریٹیشن Against Interpretation بھی ہے۔ Illness as Metaphor. اس کا ترجمہ بھی ان کے منصوبے میں شامل تھا۔ مجھ سے George Steiner کی کتاب language and silence. کا اکثر ذکر کرتے۔ اتفاق سے چند ماہ قبل دریا گنج بک بازار میں کتاب کا دوسرا ایڈیشن مل گیا، اور میں نے انہیں اس کی اطلاع دے دی تھی۔ وہ اس قدر خوش ہوئے کہ جیسے کوئی نہ حاصل ہونے والی شے مجھے مل گئی ہو۔ کاغذ اتنا خستہ ہے کہ مشکل سے میں اس کے اوراق پلٹ سکا۔ یہ واحد کتاب ہے جس کا ذکر انہوں نے مجھ سے سب سے زیادہ کیا ہے۔ اور شاید اس کتاب کا ان کے ذہن میں بھی گہرا اثر قبول کیا۔ جارج اسٹائنر کی کتاب 'ٹالسٹائی اور دوستوفسکی' 'این اے سے ان کنٹراسٹ' کے ذکر سے وہ بہت خوش ہوئے تھے۔ ہربٹ ریڈ کتاب 'موڈرن آرٹ' سے بھی وہ بہت متاثر تھے۔ اردو میں ہربٹ ریڈ کا پہلا تذکرہ محمد حسن نے اپنی کتاب 'اردو میں رومانوی تحریک' میں کیا ہے۔ محمود ہاشمی کا ایک مختصر سا مضمون ہربٹ ریڈ پر موجود ہے جو ان کی کتاب 'انبوہ زوال پرستاں' میں شامل ہے۔ اتفاق سے ہربٹ ریڈ کی یہ کتاب بھی بک بازار میں مل گئی کتاب پوری طرح محفوظ ہے بس اس کا فرنٹ پیج نہیں ہے۔ خلیل مامون صاحب کو قدیم ہندوستان کی تاریخ اور تہذیب سے گہری دلچسپی تھی۔ تصوف کی طرف ان کا میلان تھا۔ وہ اکثر کہتے ہیں کہ میں بزرگوں کا یعنی مشائخ کا عقیدت مند ہوں۔ وہ دنیاوی معاملات میں تقدیر کے بہت قائل تھے۔ عقیدہ اتنا مضبوط تھا کہ انہیں اپنے اور دوسروں کے معاملے میں زیادہ پریشانی نہیں ہوتی تھی۔ وہ اس معنی میں کہ دکھ اور افسوس اپنی جگہ مگر قدرت کا فیصلہ ہے۔ خلیل مامون صاحب نے امیر خسرو پر ایک جلسے کا منصوبہ بنایا۔ مجھ سے ایک سیشن میں مقالہ پڑھنے یا گفتگو کرنے کے لیے کہا تھا۔ میں نے حامی بھی بھر لی تھی مگر میں شریک نہیں ہو سکا تھا۔ اس کا رنج بھی تھا اور تکلیف بھی۔ مگر فارسی کے ایک اسکالر کا جب نام پیش کیا تو وہ خوش ہوئے۔ امیر خسرو کی شخصیت کے کئی رنگ ہیں اور ان کو ہر رنگ میں دلچسپی تھی۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ امیر خسرو پر اردو میں جو تنقید لکھی گئی ہے ان کا جائزہ لیا جائے۔ اس ضمن میں ممتاز حسین کا نام آیا تھا اور مجھے اسی پر گفتگو کرنی تھی۔ جیتے جی انہوں نے بہت سے منصوبے بنائے اور اس معاملے میں ان کے یہاں ایک خواب کی صورت تھی۔ انہیں کبھی یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وقت بہت تیزی کے ساتھ نکل رہا ہے یا بہت وقت نکل چکا ہے۔ اس وقت یاد نہیں کہ 'نیا ادب' کے کتنے شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک شمارہ ایسا بھی تھا جس میں کلیم عاجز کی شاعری اور شخصیت پر مضامین تھے اور شاعری

کا انتخاب بھی۔ وہ کلیم عاجز کی شاعری کو اہمیت دیتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ نیچرل شاعر ہیں، اس معنی میں کہ انہوں نے تاریخی حادثے کو ذات کے حوالے سے آفاقی رنگ عطا کر دیا۔ ان کی علم دوستی اور ادب سے سچی وابستگی نے مجھے حوصلہ بخشا ہے۔ 'نیا ادب' کا جو تازہ شمارہ ان کے پیش نظر تھا، اس کے سلسلے میں اپنے انتقال سے ایک دن پہلے لمبی گفتگو کی تھی۔ اتنے مسائل ان کے ذہن میں تھے کہ جیسے ایک شمارہ ان سب کا بوجھ اٹھالے گا۔ اب محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے جن ادیبوں پر مضامین شائع کرنے کا ارادہ کیا تھا، وہ دراصل ان کی اس آگہی کا نتیجہ تھا کہ پتہ نہیں پھر وقت ملے یا نہ ملے۔ کاش ایسا ہو کہ جو شمارہ وہ جس طرح کا شائع کرنا چاہتے تھے اس کا کوئی مسودہ یا تحریری شکل میں کوئی خاکہ مل جائے تو اس کو اس صورت میں مرتب کیا جا سکے۔ 'نیا ادب' کا ایک شمارہ تقریباً دہلی میں تیار ہوا اور اس میں میرے کئی عزیز شاگرد شریک تھے۔ ڈاکٹر عبدالسمیع کی کتاب 'اردو میں نثری نظم' بہت پسند تھی اور وہ چاہتے تھے کہ عبدالسمیع نثری نظم کا ایک انتخاب کتابی صورت میں شائع کریں۔ ڈاکٹر محضر رضا کی مرتبہ کتاب 'مکاتیب قاضی عبدالودود' جب انہیں ملی تو مجھے فون کیا اور محضر کے بارے میں دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ دو جلدوں میں قاضی عبدالودود کے یہ خطوط ہماری ادبی تاریخ کا ایک اہم حوالہ ہے۔ خلیل مامون صاحب قاضی صاحب کے خطوط پڑھتے جاتے کبھی مجھے تو کبھی محضر کو فون کرتے۔ ایک مرتبہ اس حد تک کہا کہ باہر کی دنیا میں بھی بہت کم ایسی شخصیات ہوں گی جیسی کہ قاضی صاحب کی تھی۔ ان کے نزدیک قاضی عبدالودود کا سب سے بڑا امتیاز ان کا مطالعہ اور ذہن کا حاضر اور مرتب ہونا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ تحقیق میں اتنا معروضی ذہن اردو کو شاید پہلی بار ملا۔ انہیں اس بات کا بھی احساس تھا کہ قاضی صاحب کی رینج بہت پھیلی ہوئی ہے اس کی وجہ دوسری زبانوں سے ان کی واقفیت ہے۔ انہیں اس بات پر رنج تھا کہ اتنے اہم خطوط پر کوئی جلسہ نہیں ہوا اور نہ کسی نے اس پر توجہ صرف کی۔ لیکن محضر کی محنت ضائع نہیں ہوگی۔ ان کا یہ بھی ارادہ تھا کہ بنگلور میں قاضی عبدالودود پر دو دن کا جلسہ کیا جائے اور ایک سیشن ان مکاتیب پر مشتمل ہو۔ مجھے ان کے اس جوش، جذبے نے جتنا متاثر کیا تھا اس کا اظہار لفظوں میں ممکن نہیں۔ وہ ہمیشہ قاضی صاحب کے ذکر کا کوئی پہلو نکال لیتے۔ قاضی صاحب کی تحقیق کے حوالے سے وہ کسی ورق یا اقتباس پر ٹھہر جاتے اور پھر ان کی کال آجاتی۔

'انکاؤنٹر' میں شائع ہونے والے اسپنڈر کے مضمون کا محمود ایاز نے ترجمہ کیا تھا۔ اس کی شائع شدہ کاپی اکرم نقاش صاحب نے مجھے عنایت کی تھی۔ انہی دنوں محمد حسن عسکری پر میں کتاب لکھ رہا تھا

اور عسکری کے کالم میں اسپینڈر کا ذکر تھا۔ خلیل مامون حسن عسکری کے اس کالم کا مجھ سے تقاضا کرتے رہے۔ وہ چاہتے تھے کہ 'ان کاؤنٹر' اور اسپینڈر پر کوئی ایک مضمون 'نیا ادب' کے تازہ شمارے میں شامل ہو۔ 2023 کے دسمبر میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے انٹرنیشنل سمینار میں وہ غالب ایوارڈ برائے شاعری لینے کے لیے دہلی آئے تھے۔ اسی دن ان کی واپسی ہوگئی۔ ہمیشہ کی طرح وہ بشاش نظر آئے۔ ان کا ذہنی افق عام طور پر مجلس آرائی سے کہیں دور جا پڑتا تھا۔ انہیں جلسوں میں تو دیکھا نہیں مگر ان کی گفتگو سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ جو مقالے پڑھے جاتے ہیں، وہ کیوں کر پسند نہیں آتے تھے۔ ایک کلیدی خطبے کا ذکر آیا تو میں نے اپنی مایوسی کا اظہار کیا۔ کہنے لگے کہ آپ نے کچھ زیادہ توقع باندھ لی ہیں۔ اسے چلنے دیجیے آپ کچھ نہیں کر سکتے۔ تازہ شمارے میں بانی پر ایک گوشہ شائع کرنا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر ثاقب فریدی کی بانی پر کتاب ان کی نظر میں بانی کے تعلق سے جمود کو توڑنے کی کوشش ہے۔ وہ کچھ اچھوتے اور اچھے ادبی کاموں کی اتنی داد دیتے تھے کہ جیسے ان پر کوئی کام ہوا ہو۔ تازہ شمارے میں وہ فکشن پر مذاکرے میں ہونے والی گفتگو کو شائع کرنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستان میں جو فکشن لکھا جا رہا ہے اس پر چند سنجیدہ لوگوں سے گفتگو کی درخواست کی جائے۔ ویبینار کی شکل میں۔ پاکستان سے ناصر عباس نیر اور اصغر ندیم سید کو اس گفتگو میں شریک کرنا چاہتے تھے۔

''سرور ان دونوں حضرات سے آپ بات کر لیجیے، میں بھی بات کر لوں گا''

''نہیں پہلے آپ بات کر لیجیے''

سرور جو ناول ادھر شائع ہوئے ان کے بارے میں بے باکانہ گفتگو ہونی چاہیے۔ میں نہیں چاہتا کہ بس یوں ہی تعریف اور توصیف کے ساتھ یہ مذاکرہ ختم ہو جائے، بہت تعریفیں ہوگئی ہیں لوگ اتنا خوش کرتے ہیں کہ مت پوچھے۔ اس کی ذمہ داری محضر کو دیجیے یا عبدالسمیع کو۔

فکشن کے بارے میں ان کی جو سمجھ تھی وہ مغربی ناولوں کے مطالعے سے بنی تھی۔ اردو ناولوں کا یا ہندوستانی ناولوں کا مطالعہ تو تھا ہی۔ مجموعی طور پر وہ کسی موضوع یا اسلوب کے سلسلے میں جذباتی نہیں ہوتے تھے۔ کئی ناولوں کے بارے میں ان کی رائے جزوی طور پر ٹھیک تھی ورنہ تو رد کر دیتے تھے۔ یہ اردو کے وہ ناول ہیں جو گزشتہ چند مہینوں اور برسوں میں لکھے گئے۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ وہ اپنی رائے کو محفوظ رکھتے تھے اور سننے کا ان میں بہت حوصلہ تھا۔ ایک ناول کی وہ تعریف کر رہے تھے، میری رائے مختلف تھی۔ اتنا کہا تھا کہ دیکھیے امیجینیشن کی بہت کمی ہے۔

کتنے برس ہو گئے بنگلور سے فون آتے ہوئے۔ کتنے دن ہو گئے محمود ایاز کو خلیل مامون کی گفتگو میں سنتے اور دیکھتے ہوئے۔ کتنے برس بیت گئے فون پر گفتگو کرتے ہوئے اور پھر ایک لمبی خاموشی۔ سرور بیدل عظیم آبادی کا مدرسہ آپ دیکھ آئے، کیسا محسوس ہوا؟ آپ نے جو لکھا ہے، اب ایسا کیجئے کہ ان پر کوئی کام ہونا چاہیے۔ آپ کی نظر میں کون ہے جو بیدل کے کلام کا اردو میں ترجمہ کر سکتا ہے؟ مجھے بیدل بہت پسند ہے۔ پٹنہ اور اس کے مضافات میں بیدل کی کچھ اور باقیات تلاش کیجئے۔ ابا کیسے ہیں ان کو سلام کہیے۔ علیم صبا نویدی کی کتاب بھیجی جا رہی ہے۔ جنوب میں اردو ادب کی تاریخ سے متعلق ہے۔ بہت محنت سے کتاب لکھی گئی ہے۔ دیکھیے گا۔ انتظار حسین سے میں نے بلراج مین را کا ذکر کیا۔ کہنے لگے اس نے تو لکھنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ میرا جواب تھا کہ آپ لوگوں نے لکھنے نہیں دیا۔ بلراج مین را کی شخصیت کا دوسرا نام ایمانداری ہے۔ وہ پوری طرح اسٹیبلشمنٹ کے خلاف تھا۔ اس نے ایک رائٹر کی زندگی جی ہے۔ سرور مغرب میں بھی مین را جیسے لوگ کم ملیں گے۔

ایک گفتگو میں اتنے خیالات اتنی باتیں۔ کوئی سرشاری سی سرشاری ہے۔ موسم آپ کے یہاں سخت ہوگا۔ جی! یہاں گرمی بہت ہے آپ کے یہاں تو موسم اچھا ہوگا۔ ''یہاں بارشیں ہو رہی ہیں''

یہ جملہ میرے لیے صرف ایک شہر کے موسم کی خبر نہیں تھی۔ اس میں پورا وجود نہایا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ 'بارشیں' کیا حسن ہے لفظ میں اس کی ادائیگی میں۔ بارشیں بنگلور میں ہو رہی ہیں۔ اس کے چھینٹے دہلی اور عظیم آباد اور اس کے مضافات میں پڑتے تھے۔ 'بارشیں ہو رہی ہیں' یہ جملہ کتنا تخلیقی اور واقعی ہے۔ بارش ہوتی ہے یا بارش کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔ بارش کی بوندیں شاید کہتی ہیں۔ 'بارشیں ہو رہی ہیں' بارشیں رک رک کر ہو رہی ہیں۔ کہیں کی رکی ہوئی بارشیں، کہیں اور کی بارشیں ہوتی ہیں۔ جنوب کی بارشیں اور شمال کی بارشیں۔ بھیگی بھیگی سی طبیعت میں بھیگا بھیگا سا ترنم۔ سرور بارش میں نکل جاتا ہوں۔ کسی شہر کا موسم بارش میں بھیگنے کا مفہوم بدل سکتا ہے۔ بارش کا ایسا ذکر کہ جیسے خشکی کا موسم بھیگا بھیگا ہو۔ خلیل مامون کی طبیعت کی طرح۔ کوئی تار بارش تھا۔ کوئی تار نظر تھا۔ 'بارشیں ہو رہی ہیں' آج یہاں دھوپ بہت سخت تھی۔ کل نہیں بلکہ پرسوں بارش ہوئی تھی۔ 'آفاق کی طرف، جسم و جاں سے دور، سرسوتی کے کنارے، اندھیرے اجالے میں، سانسوں کے پار، لا الہٰ

نگاہ کتنی دور تک ان کتابوں کے ساتھ جا سکتی ہے۔ یہ کتابوں کے محض نام نہیں، زندگی کے

استعارے ہیں۔ زندگی کے حقائق ہیں۔ان میں 'بن باس کا جھوٹ' شامل نہیں۔ یہ کوئی اور قصہ ہے۔ جو سچ کے ساتھ جھوٹ کو آئینہ دکھاتا ہے۔ 'نشاط غم' یہیں کہیں 'اندھیرے اجالے میں' گم ہے۔ 'تاثرات' خیال کی کس منزل کا پتہ دیتے ہیں۔ چند تبصرے چند باتیں۔ 'لسان فلسفے کے آئینے میں' کم لوگوں نے پڑھا اور کم لوگوں نے جانا۔ مصنف بے نیاز تھا۔ 'ہیڈیگر کے نظام فکر میں انسان' 'ہسرل کی 'لسانی مظہریات' یہ آگہی ایک شاعر کے اندر کی وہ آگ تھی جس سے مفر ممکن نہیں۔ لیکن کتنے شاعروں نے مفر کی راہ نکال لی۔ پوچھ کر تو دیکھیے ہیڈیگر کون تھا۔ ہسرل کی لسانی مظہر یات کیا ہے؟ خلیل مامون نے کبھی کہا نہیں میرے یہ مضامین پڑھ کر تو دیکھیے۔ خاموشی کہتی تھی شاعر ہو یا ادیب۔ لسانیات کا علم ضروری ہے۔ اس معنی میں ضروری نہیں کہ اس کو جانے بغیر شعر نہیں کہا جا سکتا یا فکشن نہیں لکھا جا سکتا۔ بات اتنی ہے کہ آگہی کا عذاب۔ اس کے بغیر کیسے رہا جا سکتا ہے۔ بہت لوگ اس کے بغیر کتنے بشاش اور آسودہ ہیں۔ خلیل مامون کی غزل کے یہ اشعار کیا کہتے ہیں:

درد کی رات گزر جائے تو سو جاؤں گا
صبح کی بات بسر جائے تو سو جاؤں گا
نیند کی آس میں پنچھی کی طرح منڈلاتا
آنکھ سے خواب اتر جائے تو سو جاؤں گا
ساعت غم سے بندھا دوڑ رہا ہوں کب سے
وقت کچھ دیر ٹھہر جائے تو سو جاؤں گا
دشت امکاں میں نہیں ملتا کہیں دل کا سراغ
دور دنیا سے نظر جائے تو سو جاؤں گا
جنگ میں نغمۂ گل ڈھونڈ رہا ہوں مامون
تیغ سینے میں اتر جائے تو سو جاؤں گا

○

مشتاق احمد

سرگرمیاں

غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام آن لائن اردو، فارسی اور موسیقی کلاسز کا افتتاح

3 جولائی 2023

غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام آن لائن اردو، فارسی اور موسیقی کلاسز کا افتتاح ایوان غالب میں ہوا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے مہمانوں اور طلبا کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ یہ چھ مہینے کا کورس ہے اور ہم سال میں دو مرتبہ چھ چھ مہینوں کے دو بیچ کا اہتمام کرتے ہیں۔ مجھے بے حد خوشی ہے کہ اس کورس میں ملک ہی نہیں بیرون ملک کے طلبا بھی شرکت کرتے ہیں۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت سابق صدر شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، پروفیسر قاضی عبید الرحمن ہاشمی نے فرمائی۔ اپنے صدارتی خطاب میں انھوں نے کہا کہ مجھے بہت خوشی ہوئی کہ اس ادارے نے اردو، فارسی اور موسیقی کی بنیادی تربیت کا بھی انتظام کیا ہے۔ سابق ڈین فیکلٹی آف آرٹس جامعہ ملیہ اسلامیہ، پروفیسر وہاج الدین علوی نے آن لائن کلاسز کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ آج سے پہلے میں ہمیشہ یہاں کسی علمی مذاکرے میں شرکت کی غرض سے آیا ہوں، لیکن مجھے ہمیشہ یہ فکر رہتی ہے کہ جس معیاری ادب کی بات ہم کرتے ہیں کیا اس کے مسائل میں اگلی نسل کی عملی شرکت ممکن ہو سکے گی؟ یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم اگلی نسل کو کم از کم بنیادی تعلیم سے واقف کرا دیں۔ اردو فارسی کلاس کے استاد جناب طاہر الحسن نے کہا کہ مجھے امید ہے کہ آج سے ہم جس بیچ کا آغاز کر رہے ہیں وہ بھی مثل سابق بہت کامیاب رہے گا۔ موسیقی کے استاد جناب عبدالرحمن نے کہا کہ موسیقی بھی ایک زبان ہے اور ہر زبان کی طرح اس کے قواعد ہیں جو ریاضت سے ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔ واضح رہے کہ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ذریعے یہ چھ ماہی کورس 3 جولائی سے شروع ہو رہا ہے اور دسمبر میں مکمل ہوگا۔ دوشنبہ، منگل اور بدھ کو اردو کی کلاس

اور جمعرات و جمعہ کو فارسی کی کلاس ہوں گی۔ ہفتے میں دو دن بدھ اور جمعے کو موسیقی کی کلاس ہوں گی۔ یہ کلاس شام میں پانچ بجے آن لائن ہوں گی۔

غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام بیگم عابدہ احمد یادگاری خطبے کا انعقاد
17 جولائی 2023

غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام بیگم عابدہ احمد یادگاری خطبے کا انعقاد کیا گیا۔ اس یادگاری خطبے کو معروف دانشور ڈاکٹر سیدہ سیدین حمید نے 'تعلیم کے فروغ اور قومی تعمیر میں مسلم خواتین کا کردار' کے موضوع پر خطاب کیا۔ اپنے خطاب میں انھوں نے فرمایا کہ مسلم خواتین کے قائدانہ کردار پر جب ہم بات کرتے ہیں تو عام خیال یہ ہوتا ہے کہ گفتگو 1947 کے بعد سے شروع ہوگی۔ حالانکہ میں نے جب اس موضوع پر مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ 1857 میں بھی ہمارے یہاں ایسی خواتین تھیں جن کی قائدانہ صلاحیتوں نے انگریزی منصوبوں کو کافی حد تک بے اثر کر دیا تھا۔ ہم نے مسلم خواتین کے خود ساختہ مسائل کو موضوع بنایا جن سے سیاسی مقاصد بھی حل ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ انسانی فروغ کے سلسلے میں ان کے کیا مسائل ہیں ان پر سچر کمیٹی کے بعد سے بہت کم توجہ دی گئی بلکہ کہنا چاہیے نہیں دی گئی۔ اس خطبے کی صدارت غالب انسٹی ٹیوٹ کے چیئرمین جسٹس جناب بدر دریز احمد صاحب نے کی۔ صدارتی خطاب میں انھوں نے کہا کہ بیگم عابدہ احمد ایک منصوبہ ساز شخصیت کی مالک تھیں۔ انھوں نے جو اقدام کیے ان کے نتائج کا فیضان آج تک عام ہے۔ آج کے خطبے کا موضوع اور ان کی شخصیت میں گہرا ربط ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی نے استقبالیہ کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ عزت مآب فخر الدین علی احمد ہوں یا بیگم عابدہ احمد صاحبہ ان کی شخصیت اتنی پہلو دار تھی کہ انھیں کسی ایک خانے میں مقید کرنا زیادتی ہوگی۔ پروفیسر اختر الواسع اس خطبے میں بطور مہمان خصوصی شریک تھے۔ اپنے خطاب میں انھوں نے کہا کہ خواتین کے مسائل وہ بھی ہیں جن کو عام طور پر پیش کیا جاتا ہے لیکن وہ مسائل زیادہ اہم ہیں جن کو چھپایا جاتا ہے یا ان پر بات کرنے سے گریز کیا جاتا ہے۔ سیدہ سیدین صاحبہ نے جس موضوع کو اٹھایا ہے میں سمجھتا ہوں اس کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ سال میں دو یادگاری خطبات کا انعقاد کرتا ہے۔ ایک فخر الدین علی احمد یادگاری خطبہ اور دوسرا بیگم عابدہ احمد یادگاری خطبہ۔ ابھی

گذشتہ 22 مئی کو یہاں فخر الدین علی احمد یادگاری خطبے کا انعقاد کیا گیا تھا جس میں پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ کے وائس چانسلر پروفیسر اروند تشریف لائے تھے۔ آج بیگم عابدہ احمد میموریل لکچر کے لیے بھی ہم نے ڈاکٹر سیدہ سیدین جیسی علمی شخصیت سے گزارش کی جو ہمارے درمیان خطبہ دینے کے لیے موجود ہیں۔ بیگم عابدہ احمد 1982 سے 2003 تک غالب انسٹی ٹیوٹ کی چیئر مین رہیں۔ آپ نے ہی اس ادارے میں غالب میوزیم اور ہم سب ڈرامہ گروپ کی بنیاد رکھی تھی۔ آج یہ ادارہ جس منزل پر ہے اس میں بیگم صاحبہ کی قربانیاں شامل ہیں۔ اس موقع پر علم وادب اور سماجی شعبوں سے وابستہ افراد نے کثیر تعداد میں شرکت فرمائی۔

غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام پوسٹر سازی مقابلے کا انعقاد

27 جولائی 2023

غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام غالب کے پوسٹر سازی کا مقابلے کا ایوان غالب میں انعقاد ہوا۔ اس موقع پر غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ کی ہمیشہ کوشش رہتی ہے کہ کلام غالب کو فنون لطیفہ کے تمام وسیلوں سے عوام تک پہنچایا جائے مجھے بہت خوشی ہے کہ آج غالب کی شاعری کو تصویروں کے ذریعے پیش کیا جارہا ہے۔ اس مقابلے کا فیصلہ پروفیسر آصف نقوی اور پروفیسر غفران قدوائی نے کیا۔ پروفیسر آصف نقوی نے کہا کہ غالب کی شاعری اتنے فنی اور تہذیبی پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے کہ ہر فنکار اسے اپنے فن میں ظاہر کرنے پر فخر محسوس کرتا ہے۔ پروفیسر غفران قدوائی نے کہا کہ آج کے مقابلے میں جن بچوں نے اپنے فن کے جوہر پیش کیے ہیں مجھے امید ہے کہ مستقبل میں یہ فن ان کی شناخت ثابت ہوگا۔ پروگرام کی کنوینر محترمہ یاسمین فاطمہ نے کہا کہ غالب اردو کے سب سے مقبول شاعر ہیں انہیں ہم فنون لطیفہ کے جس پہلو سے بھی دیکھتے ہیں وہ مکمل شاعر نظر آتے ہیں۔ مقابلے میں کامیاب ہونے والے طلبا کو مومنٹو، سرٹیفکٹ، دیوان غالب اردو ہندی اور 500 روپے نقد پیش کیے گئے۔ پہلا انعام لاعبہ گلزار (کرسینٹ پبلک اسکول، دریا گنج، دہلی)، دوسرا انعام انشول پٹوال (سالوان پبلک اسکول، ٹرونیکا سٹی، غازی آباد)، تیسرا انعام ارچنا گپتا (سالوان پبلک اسکول، ٹرونیکا سٹی، غازی آباد)، چوتھا انعام محترمہ ریم (اینگلو عربک ماڈل اسکول، اجمیری گیٹ، دہلی) اور خصوصی انعام حسن خان (کرسینٹ پبلک اسکول، دریا گنج، دہلی) کو دیا گیا۔ صوفیہ، عارفہ، یاسمین، یسریٰ، محمد احمد، محمد حسین

کو سرٹیفکٹ، دیوان غالب اور 500 روپے نقد دیے گئے۔ اس کے علاوہ دیگر مقابلہ سازی میں شریک طلبا و طالبات کو سرٹیفکٹ اور دیوان غالب دیا گیا۔

غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام شام غزل کا انعقاد

1 ستمبر 2023

غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام اردو، فارسی اور موسیقی کلاسز کا مشترکہ اجلاس ایوان غالب میں منعقد ہوا۔ اس مشترکہ اجلاس کی صدارت معروف موسیقار جناب عبدالحمید نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ذریعے منعقد ہونے والی کلاسز کی خوبی یہ ہے کہ اس میں آن لائن اردو فارسی اور موسیقی کی تعلیم دی جاتی ہے اور اس سے طلبا کو بہت فائدہ ہو رہا ہے۔ جناب جسٹس وی این سنہا نے بطور مہمان اعزازی شرکت کی اور فرمایا کہ غالب کو مقبول بنانے میں موسیقاروں کا بھی اہم رول ہے۔ معروف سماجی کارکن جناب سشیل کمار ورما نے اس پروگرام میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ اس موقع پر انھوں نے کہا کہ غالب کو موسیقی کے ذریعے جاننا بڑا خوبصورت تجربہ ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے منعقد ہونے والی کلاسز میں اس کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے کہ ان کلاسز کا ایک مشترکہ اجلاس منعقد کیا جائے تاکہ طلبا جو کچھ مختلف سیکھ سکیں۔ اردو فارسی کلاس کے استاد جناب طاہر الحسن نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ غالب نے اپنی شاعری میں جن تجربات کو نظم کیا ہے آج دنیا ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے۔ موسیقی کے استاد جناب استاد عبدالرحمن نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ذریعے منعقد ہونے والے کلاسز میں موسیقی کی بنیادی تعلیم دی جاتی ہے۔ افتتاحی اجلاس کے بعد شام غزل کا اہتمام ہوا جس میں استاد عبدالرحمن اور دوسرے فنکاروں نے کلام غالب اور دیگر شاعروں کی غزلیں پیش کیں۔ شکریے کی رسم غالب انسٹی ٹیوٹ کے لائبریرین جناب مشتاق احمد نے ادا کی انھوں نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ میں علمی اور ثقافتی پروگرام منعقد ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن اس شام غزل کا اپنا خاص امتیاز ہے۔ اس کے ذریعے ہم اپنے نئے طلبا کی پیش رفت سے بھی واقف ہوتے ہیں اور جو طلبا اس میں کلام پیش نہیں کرتے ان کی بھی تربیت اس طرح ہو جاتی ہے کہ وہ عملاً سروں کی ادائیگی اور تلفظ سے واقف ہو جاتے ہیں۔ میں اپنی اور ادارے کی جانب سے تمام شرکا کا تہ دل سے شکریہ

ادا کرتا ہوں۔

غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام دوروزہ قومی سمینار
'غالب کے تین اہم معاصرین: صہبائی، آزردہ اور شیفتہ کا انعقاد
23-24 ستمبر 2023

صہبائی آزردہ اور شیفتہ غالب کے ایسے معاصرین ہیں جو صرف شاعر نثر نگار اور محقق ہی نہیں سماجی زندگی میں فعال اور نظریہ ساز شخصیت کے مالک تھے۔ وہ اس نشاۃ الثانیہ کے نقیب تھے جو شمالی ہند میں رونما ہوئی اور جس کے نتیجے میں وہ خود اعتمادی پیدا ہوئی جس نے 1857 کی پہلی جنگ آزادی کے لیے زمین ہموار کی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ذمہ داران لائق مبارکباد ہیں جنھوں نے ان تین معاصرین غالب کا انتخاب کیا اور ان پر باقاعدہ مذاکرے کا انعقاد کیا۔ ان خیالات کا اظہار فارسی و اردو کی عالمی شہرت یافتہ اسکالر پروفیسر آذرمی دخت صفوی نے غالب انسٹی ٹیوٹ میں منعقد دوروزہ قومی سمینار 'غالب کے تین اہم معاصرین: صہبائی آزردہ اور شیفتہ' کے افتتاحی اجلاس میں کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کیا۔ سمینار کا افتتاح سابق سکریٹری حکومت ہند جناب نوید مسعود نے کیا۔ اس موقع پر انھوں نے کہا کہ غالب کی شخصیت اپنے عہد میں ایسی نمایاں ہوئی کہ دیگر افراد اس میں دب گئے حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو دہلی میں اس وقت تمام ایسی شخصیات کا مجمع تھا جو اپنے اپنے فن میں کامل نظر آتی ہیں۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے فرمائی اپنے صدارتی خطاب میں انھوں نے کہا کہ معاصرین غالب کے تعلق سے یہاں پہلے بھی سمینار منعقد ہوئے ہیں لیکن یہ تین حضرات ذیلی طور پر تو زیر بحث آئے لیکن ان پر باضابطہ اب تک سمینار نہیں ہوا تھا۔ آج کا یہ سمینار ایک اہم گوشے کو روشن کرے گا اور مجھے امید ہے کہ جب یہ مقالات کتابی شکل میں شائع ہوں گے تو اس موضوع پر لوگ پھر سے توجہ کریں گے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے مہمانوں اور حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ غالب کے تین اہم معاصرین صہبائی، آزردہ اور شیفتہ کی شخصیت اردو اور فارسی ادب کے تعلق سے نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ سمینار کے دوسرے دن مقالات کا سلسلہ صبح دس بجے سے شام پانچ بجے تک جاری رہا۔ سمینار کے پہلے اجلاس کی صدارت شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کی صدر پروفیسر نجمہ رحمانی نے فرمائی۔ اس اجلاس میں پروفیسر عمر کمال الدین نے 'گلشن بے خار پر ایک نظر' پروفیسر علیم اشرف

نے 'شیفتہ بحیثیت تذکرہ نگار' پروفیسر کلیم اصغر نے 'رسالہ قواعد صرف ونحو مصنفہ صہبائی پر ایک نظر' اور ڈاکٹر مشتاق تجاروی نے 'شیفتہ اور غالب' کے موضوع پر مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر علی احمد ادریسی نے کی۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر شریف حسین قاسمی نے فرمائی۔ اس اجلاس میں پروفیسر عراق رضا زیدی نے 'صہبائی کی فارسی گوئی' ڈاکٹر شمس بدایونی نے 'اردو میں انگریزی رموز اوقاف اور صہبائی'، ڈاکٹر واحد نظیر نے 'آزردہ کا تذکرہ ایک جائزہ' کے موضوع پر مقالات پیش کیے اس اجلاس میں نظامت کے فرائض ڈاکٹر امیر حمزہ نے ادا کی۔ تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر عمر کمال الدین نے فرمائی۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر قمر عالم نے 'مولانا آزاد لائبریری میں آثار شیفتہ کے خطی نسخوں کا تعارف'، ڈاکٹر یاسر عباس نے 'آزردہ بحیثیت فارسی گو' اور ڈاکٹر مخضر رضا نے 'صہبائی اپنے معاصرین کی نظر میں' کے موضوعات پر مقالے پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر شاداب شمیم نے کی۔ چوتھے اور آخری اجلاس کی صدارت پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے فرمائی۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر محمود فیاض ہاشمی نے 'شیفتہ کی فارسی گوئی'، پروفیسر احمد محفوظ نے 'شیفتہ کا تنقیدی شعور' اور ڈاکٹر محمد مقیم نے 'شیفتہ کی غزل گوئی چند معروضات' کے موضوع پر مقالات پیش کیے اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر سفینہ نے کی۔

غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام 'خالد محمود: شخصیت اور ادبی خدمات' پر مذاکرے کا انعقاد

12 اکتوبر 2023

غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام جناب سیفی سرونجی اور محترمہ استوتی اگروال کی مرتبہ کتاب 'خالد محمود: شخصیت اور ادبی خدمات' پر مذاکرے کا ایوان غالب میں انعقاد کیا گیا۔ اس مذاکرے کی صدارت سابق چیف الکشن کمشنر جناب ڈاکٹر ایس وائی قریشی نے فرمائی۔ اپنے صدارت خطاب میں انھوں نے کہا کہ خالد محمود صاحب سے میں پہلے بھی واقف تھا لیکن اس کتاب کے ذریعے ان کی شخصیت کے تمام پہلو مجھ پر روشن ہو گئے ہیں۔ جلسے کے مہمان خصوصی اور دہلی کے سابق لفٹننٹ گورنر جناب نجیب جنگ صاحب نے کتاب پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ خالد محمود صاحب سے میری پہلی ملاقات بہت یادگار تھی اور وہ آج تک میرے حافظے میں محفوظ ہے۔ انھوں نے جس ادارے کی ذمہ داری قبول اس کی قسمت بدل کر رکھ دی۔ اجلاس کے

مہمان اعزازی جناب چندر بھان خیال نے اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے کہا کہ خالد محمود اگر چہ میرے استاد نہیں ہیں لیکن میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ ان کی شخصیت میں کمال کا انہماک ہے جس چیز میں لگ جاتے ہیں اس میں ایک منفرد شان پیدا کر دیتے ہیں۔ اس کتاب کے مرتب جناب سیفی سرونجی صاحب نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ خالد محمود صاحب میرے استاد بھی رہے ہیں اور ایک ادیب کی حیثیت سے ان کا اسلوب تربیت کا وسیلہ ہے۔ ان سے ہر ملاقات میں بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ محترمہ استوتی اگروال نے اس کتاب کی ترتیب میں بہت محنت کی ہے وہ زیادہ مبارکباد کی مستحق ہیں۔ اس موقع پر پروفیسر شہپر رسول، پروفیسر معین الدین جینا بڑے، پروفیسر شہزاد انجم، پروفیسر سراج اجملی، پروفیسر ابوبکر عباد، پروفیسر تسنیم فاطمہ، جناب راشد جمال فاروقی، محترمہ فوزیہ رباب، ڈاکٹر نعمان قیصر، اور ڈاکٹر فیضان شاہد نے کتاب کے اہم گوشوں اور خالد محمود صاحب کی شخصیت پر سیر حاصل گفتگو کی۔ اجلاس کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر خالد مبشر نے انجام دیے اور ادارے کی جانب سے استقبالیہ کلمات ڈاکٹر محضر رضا نے پیش کیے۔ محترمہ استوتی اگروال نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام سہ روزہ بین الاقوامی ریسرچ اسکالرز غالب سمینار کا انعقاد

13 تا 15 اکتوبر 2023

اردو میں تحقیق و تنقید کی روایت بہت ثروت مند ہے لیکن اس کی تابناک تاریخ پر محض فخر کرنا کافی نہیں ہے۔ نئے زمانے میں ہماری ذمہ داریاں پہلے کے مقابلے کچھ زیادہ ہیں۔ عہد حاضر میں تحقیق کے تقاضوں میں یہ بھی ہے کہ اس کو جدید ٹکنالوجی سے جوڑا جائے۔ نوجوان نسل ٹکنالوجی سے باخبر ہے ہمیں اس کی تربیت اور حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ مجھے خوشی ہے کہ عالمی شہرت یافتہ ادارہ غالب انسٹی ٹیوٹ ہر سال بین الاقوامی ریسرچ اسکالرز غالب سمینار کا انعقاد کر کے نوجوان نسل کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار اردو کے نامور نقاد و دانشور ڈاکٹر خالد علوی نے سمینار کے کلیدی خطبہ میں کیا۔ سمینار کا افتتاح جامعہ ہمدرد کے وائس چانسلر پروفیسر افشار عالم نے کیا۔ افتتاحی کلمات ادا کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ ریسرچ ایک صبر آزما کام ہے جسے بغیر تربیت حاصل کیے پورا نہیں کیا جا سکتا۔ مقالہ لکھنا تحقیق کا ایک مرحلہ ہے لیکن اسے کسی

کانفرنس میں کس طرح پیش کرنا چاہیے یہ بھی تحقیق کا ایک حصہ ہے۔ اس طرح کے سمینار اور بھی ہونے چاہیے تاکہ نوجوان نسل کو اپنی تربیت کے زیادہ مواقع مل سکیں۔ استقبالیہ کلمات ادا کرتے ہوئے غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی نے کہا، غالب انسٹی ٹیوٹ کے پروگراموں میں ریسرچ اسکالرز سمینار مجھے اس لیے بہت پسند ہے کہ اس کے ذریعے سے طلبا کی تربیت بھی ہو جاتی ہے اور وہ ایک دوسرے کے قریب بھی آتے ہیں۔ سمینار کی صدارت اردو کے ممتاز ناقد پروفیسر عتیق اللہ نے فرمائی۔ اپنے صدارتی خطاب میں انھوں نے کہا کہ تحقیق میں موضوع اور تحقیق کرنے والے کی ہم مزاجی ضروری ہے ورنہ تحقیق کرنے والا ریسرچ کا حق ادا نہیں کر سکے گا۔ تحقیق ایک سنگلاخ وادی ہے عجلت پسندی اور ہر شے کو مادی فائدے کی نظر سے دیکھنے والا اس سفر کی تاب نہیں لا سکتا۔ مرکز تحقیقات فارسی، ایران کلچر ہاوس، نئی دہلی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر قہرمان سلیمانی نے افتتاحی اجلاس میں بطور مہمان خصوصی شرکت فرمائی اس موقع پر انھوں نے کہا کہ مجھے خوشی ہے کہ غالب انسٹی ٹیوٹ ہر سال بین الاقوامی سطح پر ریسرچ اسکالرز سمینار کا انعقاد کرتا ہے اور اس میں اردو کے علاوہ فارسی کے طلبا اور اساتذہ کو برابر کی نمائندگی دی جاتی ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ ریسرچ اسکالرز سمینار کا سلسلہ 1999 سے شروع ہوا تھا اور آج تک جاری ہے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہوتی ہے کہ ابتدا میں جن لوگوں نے اس سمینار میں ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے شرکت کی تھی آج وہ ملک کی بہترین دانشگاہوں میں تدریسی فرائض انجام دے رہے ہیں یا ادب میں اپنی نمایاں شناخت قائم کر چکے ہیں۔ میں اپنے تمام مہمانوں اور شرکا کا شکر گزار ہوں کہ آپ کی شرکت سے ہمیں بہت حوصلہ ملا۔ سمینار کے ادبی اجلاس 14 اور 15 اکتوبر کو صبح 10 بجے سے شام 5 بجے تک ایوان غالب میں منعقد کیا گیا۔ سمینار کے دوسرے روز چار اجلاس میں ملک کی معروف دانش گاہوں سے آئے ریسرچ اسکالر نے مقالات پیش کیے۔ پہلے اجلاس کی صدارت شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق صدر پروفیسر شہزاد انجم نے فرمائی۔ نظامت جناب زماں طارق نے کی اور محترمہ شہلا پروین نے 'اکیسویں صدی میں غیر افسانوی نثر کا تنقیدی جائزہ'، محترمہ مبینہ بی نے 'عہد حاضر کے سماجی مسائل اور اردو افسانہ'، جناب عبید اللہ نے 'متنبّی اور غالب کی غزل گوئی کا تقابلی مطالعہ'، جناب محمد عادل نے 'زینت اللہ جاوید کی شاعری کا تنقیدی جائزہ'، جناب سعید الرحمن انصاری نے 'مجتبیٰ حسین کی طنز و مزاح نگاری مرزا غالب کے حوالے سے'، اور جناب شاہد اقبال انصاری نے 'بنگال

میں اردو سفرنامے: چند تجزیاتی زاویے، کے موضوع پر مقالے پیش کیے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر عفت زریں نے کی۔اور نظامت جناب یوسف رضا نے کی اور محترمہ شگفتہ جہاں نے 'مغربی بنگال کے اردو ناولوں میں ہندوستانی تہذیب ومعاشرت کی عکاسی'، محترمہ ترنم آرا نے 'اماوس میں خواب: مذہبی وتہذیبی شکست وانتشار کا بیانیہ'، جناب محمد عطا اللہ نے 'آزادی کے بعد اردو کے تاریخی ناولوں کی معنویت واہمیت'، جناب عمران نے 'ترقی پسند تنقید کے ادبی تصورات'، اور جناب کفیل احمد نے 'اردو تحقیق کی تاریخ' کے موضوع پر مقالات پیش کیے۔ تیسرے اجلاس کی صدارت شعبہ فارسی دہلی یونیورسٹی کی استاد ڈاکٹر مہتاب جہاں نے فرمائی۔ اور نظامت کے فرائض محترمہ صائمہ ثمرین نے ادا کیا۔ اس اجلاس میں محترمہ حفصہ مریم نے 'مہاراجہ کشن پرشاد کی فرسی شاعری کا مختصر مطالعہ'، محترمہ صبا نعیم نے 'غالب کے فارسی نثر کا تنقیدی مطالعہ'، جناب محمد ناظم نے 'ظفر احمد صدیقی کی ادبی خدمات کی معنویت اور اہمیت'، جناب شعیب رضا نے 'زینت اللہ جاوید کی شاعری کا تقابلی مطالعہ موضوعات زبان وبیان کے حوالے سے'، اور جناب نثار احمد نے 'جدید فسانے کے اسالیب مروجہ رجحانات اور نیر مسعود کی انفرادیت' کے موضوع پر مقالات پیش کیے۔ چوتھے اجلاس کی صدارت ذاکر حسین کالج کے استاد پروفیسر مظہر احمد نے فرمائی۔ اور نظامت جناب محمد مدثر نے کیا اور محترمہ تکمینہ حبیب نے 'کلیات انشا میں مستعمل تلمیحات واصطلاحات' جناب محمد دانش نے 'نظمِ اقبال میں فطرت کے متعدد رنگ'، جناب صدام حسین نے 'اردو اصناف سخن میں صنف 'قصیدہ' کا مقام'، جناب محمد عمران رضا نے 'مکتوباتِ شاہ پیر محمد لکھنوی؛ ایک تجزیاتی مطالعہ' جناب محمد فیصل خاں نے 'قاضی عبدالستار کا ناول 'داراشکوہ' ایک ناقدانہ جائزہ' جناب انصاری عبدالرحمٰن نے 'عمادالسعادت کا تنقیدی مطالعہ'، اور جناب نور اللہ نیاز مدنی نے 'مولانا عبدالسلام ندوی کی تاریخی سوانح عمریاں: ایک تنقیدی جائزہ'، کے موضوعات پر مقالے پیش کیے۔ سمینار کے خری دن چار اجلاس منعقد ہوئے۔ پہلے اجلاس کی صدارت معروف فکشن ناقد ڈاکٹر خالد اشرف نے فرمائی اور نظامت جناب چاند رضا نے کی اور جناب محمد افروز رضا، جناب ارشد علی، جناب عبدالقدوس، محترمہ عظمیٰ پروین، محترمہ سنیتا کماری، محترمہ زرینہ نے مقالات پیش کیے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت شعبہ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے صدر پروفیسر سید کلیم اصغر نے کی۔ نظامت جناب محمد افضل زیدی نے کی اور محترمہ فاطمہ سادات میر حبیبی، محترمہ مریم علی زادہ (ایران) محترمہ کمالہ (ازبکستان)، جناب محمد مرجان علی، اور محترمہ

یاسمین فردوس نے مقالات پیش کیے۔ تیسرے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر فیاض محمود ہاشمی نے۔ اس اجلاس میں جناب محمد شکیل، جناب جسپریت سنگھ، جناب شاہنواز عالم اور جناب محمد حنبل رضا نے مقالے پیش کیے اور نظامت کا فریضہ جناب فیضان الحق نے ادا کیا۔ سمینار کے آخری اجلاس کی صدارت ڈاکٹر لئیق رضوی نے فرمائی۔ اور نظامت جناب رئیس احمد فراہی نے کی اور جناب حشمت علی، جناب محمد انظر، جناب ٹیپو سلطان اور جناب طاہر حسین نے مقالے پیش کیے۔ سمینار کے اختتام پر غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ میں دور دراز سے تشریف لائے اور دہلی کے تمام ریسرچ اسکالرز، صدور اور ناظم اجلاس کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور آپ کے روشن مستقبل کے لیے میری نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں۔

غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام بزم غزل کا انعقاد

18 اکتوبر 2023

غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام بزم غزل کا اہتمام کیا گیا۔ استقبالیہ کلمات غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے ادا کیے۔ اس موقع پر انھوں نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ ہمیشہ علمی اور ثقافتی پروگرام کا انعقاد کرتا رہتا ہے۔ آج کی شام غزل بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے، میں تمام فنکاروں کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اس موقع پر جناب امریتا دتا، جناب دھیرج کمار گروور، جناب کاشف نظامی، اور محترمہ شباب نظامی نے اپنے مخصوص انداز میں غزلیں پیش کیں۔ شام غزل کا تخیل جناب محمد اکرام مرزا اور محترمہ شہلا مرزا کا تھا۔ نظامت کے فرائض محترمہ منجوترپاٹھی اور جناب صلاح الدین نے ادا کیے۔

معروف نقاد پروفیسر شارب ردولوی کے انتقال پر غالب انسٹی ٹیوٹ کا اظہار تعزیت

23 اکتوبر 2023

اردو کے ممتاز ادیب و نقاد پروفیسر شارب ردولوی کے انتقال کی خبر نے ادبی معاشرے میں غم کی فضا قائم کر دی ہے۔ مختلف ادارے اور ادبی انجمنیں مرحوم کی یاد میں تعزیتی نشستوں کا اہتمام کر رہی ہیں۔ اردو کے ممتاز ادبی ادارے نے بھی پروفیسر شارب ردولوی کے انتقال پر اظہار تعزیت

کیا ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی نے اس موقع پر کہا کہ شارب ردولوی اردو کے اہم نقاد ہی نہیں میرے پرانے ساتھی اور دوست بھی تھے۔ ان کی تحریریں طلبا کی خصوصی توجہ کا مرکز رہی ہیں۔ خصوصاً ترقی پسند نظریات کو انھوں نے اس دور میں جدید تقاضوں کی روشنی میں واضح کرنے کی کوشش کی۔ گذشتہ چند برسوں سے ان کی صحت سے متعلق اچھی خبریں موصول نہیں ہو رہی تھیں اور آخر کار یہ افسوسناک خبر سننا ہمارا مقدر ٹھہرا۔ میں اپنی اور ادرے کی جانب سے ان کے تمام پسماندگان، احباب اور شاگردوں کی خدمت میں تعزیت پیش کرتا ہوں اور ان کی مغفرت کے لیے دعا گو ہوں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ شارب ردولوی اودھ کی پرانی تہذیب کا مرقع تھے۔ ہم ان سے گفتگو کے آداب اور نشست و برخاست کا سلیقہ سیکھتے تھے۔ میں اپنی اور ادارے کی جانب سے ان کے پسماندگان کی خدمت میں تعزیت پیش کرتا ہوں اور مغفرت کے لیے دعا گو ہوں۔ اس مشکل گھڑی میں ادارے کا ہر رکن ان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام بہ اشتراک سی عبدالحکیم کالج، میل وشارم تمل ناڈو میں سہ روزہ قومی سمینار 'جنوبی ہند میں غالب شناسی' کا انعقاد

27-29 اکتوبر 2023

اردو کے معروف اور فعال ادارے غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام بہ اشتراک سی عبدالحکیم کالج (خود مختار) میل وشارم ضلع رانی پیٹ، تمل ناڈو میں 'جنوبی ہند میں غالب شناسی' کے عنوان سے سہ روزہ قومی سمینار کا افتتاحی اجلاس جمعہ کو سی عبدالحکیم کالج آڈیٹوریم میں منعقد ہوا۔ سمینار کا افتتاح رانی پیٹ کی ضلع کلکٹر محترمہ ایس ولرمتی نے کیا۔ افتتاحی خطاب میں انھوں نے کہا کہ ہندستان تہذیبوں کا ملک ہے یہاں جتنی زبانیں اور تہذیبیں ہیں اس کی مثال دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ سمینار کا کلیدی خطبہ سابق صدر شعبہ عربی، فارسی، اردو پروفیسر قاضی حبیب احمد نے پیش کرتے ہوئے کہا کہ ویسے تو جنوبی ہند سے غالب کا رشتہ ان کی زندگی میں ہی قائم ہو چکا تھا اور ہمارے عہد تک وہ برقرار ہے لیکن اس کو مزید پختہ کرنے کی ضرورت ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ سال میں دو بار دہلی سے باہر غالب سے متعلق قومی سمینار کا انعقاد کرتا ہے۔ ہمیں احساس تھا کہ صوبہ تمل ناڈو

جو اتنا اہم خطہ ہے اب تک یہاں ہم نے کوئی سمینار نہیں کیا۔ لہٰذا آج ایک ضروری فرض کی تکمیل ہو رہی ہے۔ اظہار تشکر کا فریضہ سی عبدالحکیم کالج کے پرنسپل جناب ایس۔ اے۔ ساجد نے ادا کیا۔ اس موقع پر انھوں نے کہا کہ مرحوم سی عبدالحکیم کا خواب تھا کہ ہندستانی قوم تعلیم کے میدان میں سب سے آگے ہو۔ اپنی علمی روایت سے واقف ہوئے بغیر ہم تعلیم کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ جنوبی ہند میں بڑے سائنس داں انجینئر اور تاجر ہی نہیں بڑے ادیب نقاد اور محقق بھی پیدا ہوئے ہیں۔ میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے تمام ذمہ داران، سی عبدالحکیم کالج کے اراکین افتتاحی اجلاس کے شرکا، تمام مقالہ نگار اور صدور اجلاس اور شرکا کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ افتتاحی اجلاس کی نظامت ڈاکٹر محمد یاسر نے انجام دیے۔ افتتاحی اجلاس کے بعد تمثیلی مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا۔ سمینار کے دوسرے دن ملک کے اہم صاحبان قلم نے مقالہ خوانی کی۔ پہلے اجلاس کی صدارت صدر شعبہ اردو، سنسکرت یونیورسٹی پروفیسر عطاء اللہ خاں نے فرمائی۔ اس اجلاس میں پروفیسر شمس الہدیٰ دریابادی نے 'غالب اور دکن'، جناب محمد منیر الدین عمری نے 'جنوبی ہند کا غالب: علامہ شاکر نائطی' ڈاکٹر نشاط احمد نے 'غالب اور حیدرآباد' اور ڈاکٹر شیخ فاروق پاشا نے 'رؤف خیر کی تحریروں میں غالب شناسی کے نقوش' کے عنوان سے مقالات پیش کیے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت صدر شعبہ اردو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد نے کی۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر امان اللہ ایم بی نے 'اہل تمل میں غالب شناسی: کلام غالب کے تمل ترجم کے حوالے سے'، ڈاکٹر امین اللہ نے 'غالب دکن: یسیر کرنولی'، ڈاکٹر منظور احمد دکنی نے 'وہاب قیصر کی کتاب 'سائنس اور غالب' غالب شناسی کا سائنسی زاویہ'، پروفیسر محمد نثار احمد نے 'غالب اور ذکا: مکتوبات کے حوالے سے' ڈاکٹر ساجد حسین نے 'جنوب ہند میں غالب شناسی کی روایت'، پروفیسر عطاء اللہ خاں نے 'غالب اور ذکا' کے موضوع پر مقالات پیش کیے۔ تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر قاسم علی خاں، سابق صدر شعبہ اردو ڈاکٹر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی، حیدرآباد نے فرمائی۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر سید وصی اللہ بختیاری نے 'جنوبی ہند میں غالب شناسی: ڈاکٹر سید عبداللطیف کرنولی کے خصوصی حوالے سے'، جناب ظہیر دانش عمری نے 'دکن اور اور دیوان غالب کی شرحیں'، ڈاکٹر بشیرہ سلطانہ نے 'جنوبی ہند میں غالب شناسی' ڈاکٹر ابوبکر ابراہیم عمری نے 'علامہ شاکر نائطی اور غالب' جناب محمد سیفی عمری نے 'جنوبی ہند میں دستیاب رسائل و جرائد کے غالب نمبر'، جناب ستار فیضی نے 'تلگو زبان میں غالب شناسی' کے موضوع پر مقالات پیش کیے۔ چوتھے اور آخری اجلاس کی صدارت پروفیسر محمد امین اللہ نے کی۔

اس اجلاس میں ڈاکٹر داؤد محسن نے 'تفہیم غالب فکریات غالب کی روشنی میں'، جناب کلیم اللہ نے تامل ناڈو کے تعلیمی اداروں میں غالب شناسی'، ڈاکٹر سعید الدین نے 'اصغر ویلوری کی رباعیات میں خیالات غالب کی عکاسی'، ڈاکٹر نوراللہ نے 'جنوبی ہند کا ایک اہم ڈرامہ 'دود چراغ محفل' ایک جائزہ'، جناب سردار ساحل نے 'سلیمان اطہر جاوید کی غالب شناسی' کے موضوع پر مقالات پیش کیے۔ سمینار کے بعد رات نو بجے کل ہند مشاعرے کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت جناب انیس احمد اور نظامت جناب شفیق عابدی نے فرمائی اور شعرا میں جناب ابرار کاشف، جناب اکبر زاہد، مولانا شاکر احسن، جناب لطیف الدین لطیف، جناب شاہد مدراسی، جناب ماہر مدراسی، جناب وصی اللہ بختیاری عمری، جناب معین امر بمبو، جناب سراج زیبائی، جناب وحید پاشا قادری، جناب انور ہادی، جناب راجیو ریاض، جناب امتیاز احمد امتیازی، جناب کاتب حنیف، جنام محمود شاہد، جناب سردار ساحل، جناب ستار فیضی اور جناب داؤد محسن نے کلام پیش کیا۔

غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کے اعزاز میں استقبالیہ

5 نومبر 2023

غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام اردو کے ممتاز ادیب و نقاد اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کے اعزاز میں استقبالیہ جلسے کا انعقاد کیا گیا۔ جلسے کی صدارت سابق نائب صدر جمہوریہ ہند عزت مآب جناب حامد انصاری نے فرمائی۔ اپنے صدارتی خطاب میں انھوں نے کہا کہ پروفیسر قدوائی کا خاندانی پس منظر بہت اعلیٰ ہے آپ کے خانوادے نے جدوجہد آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور قید و بند کی صعوبتیں اٹھائیں۔ ان کے خانوادے میں دانشوری کی ایک طویل روایت رہی ہے۔ پروفیسر قدوائی نے اس روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ غالب انسٹی ٹیوٹ نے ان کے اعزاز میں استقبالیہ تقریب کا انعقاد کیا اور ان کی شایان شان کتاب شائع کی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر جناب سید شاہد مہدی نے اس تقریب میں بطور مہمان خصوصی شرکت فرمائی۔ اپنے خطاب میں انھوں نے کہا کہ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے ادب کو دیکھنے کا جو زاویہ اختیار کیا اس کو کاپی نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا اسلوب نہایت منفرد و شفاف ہے۔ انھوں نے ہر زاویے اور نظریے کو اپنی شرطوں پر دیکھا اور اسے

قبول یاد کیا ہے۔ پروفیسر ہربنس مکھیا نے اس جلسے میں بطور مہمان اعزازی شرکت فرمائی۔ انھوں نے کہا کہ پروفیسر قدوائی سے میرا پرانا تعلق ہے اور وہ ان لوگوں میں بالکل نہیں ہیں جو مصلحت کے حساب سے اپنے نظریات روز تبدیل کرتے ہیں۔ ان کی تنقید سماج اور انسانی تعلق کو واضح کرتی ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ نے کہا کہ قدوائی صاحب کی شخصیت ایسی ہے جسے علم نے حلم کی توفیق عطا کی ہے۔ انھوں نے علم کو اسلحہ بنایا، نہ اس کی تشہیر کی، نہ تحسین وتوصیف کی کسی سے امید رکھی اور نہ انعام واکرام کے لیے کوشش کی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ پروفیسر قدوائی جتنے بڑے ادیب ہیں اس سے بڑے انسان ہیں۔ ہم سب کی خواہش تھی کہ ان کے لیے استقبالیہ کا اہتمام ہو لیکن وہ ہمیشہ اس سے بچنے کی کوئی نہ کوئی صورت نکال لیتے تھے۔ مجھے ذاتی طور پر بہت خوشی ہے کہ ان کے اعزاز میں استقبالیہ تقریب منعقد ہو رہی ہے۔ شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے صدر پروفیسر احمد محفوظ نے کہا کہ مجھے فخر ہے کہ مجھے صدیق الرحمٰن قدوائی صاحب کی شاگردی نصیب ہوئی۔ دوران تعلیم میں نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ ان چند اساتذہ میں ہیں جن کا ذہن مسائل کو لے کر صاف اور کشادہ ہے۔ انیسویں صدی کی تہذیبی اور سماجی زندگی کی باریکیوں کو انھوں نے جس انداز میں جذب کیا ہے اس کی مثال دور حاضر میں ملنا بہت دشوار ہے۔ پروفیسر سرور الہدیٰ صاحب نے اپنی تقریر کے دوران کہا کہ صدیق الرحمٰن قدوائی کی کتاب 'تاثر نہ کہ تنقید' ان کتابوں میں ہے جس نے میری ذہنی تربیت میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ اس کتاب میں ان کا درد یہ ہے کہ ادب کے مطالعے کا جو ایک فطری رجحان تھا وہ رفتہ رفتہ کم ہوتا جاتا ہے اور ہم ادب کو پڑھنے سے قبل خود کو کسی نہ کسی نظریے کا پابند بنا دیتے ہیں۔ اس طرح فطری ردعمل سامنے نہیں آپاتا۔ اس موقع پر عزت مآب جناب حامد انصاری کے دست مبارک سے کتاب 'پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی ادیب و دانشور' کی رسم رونمائی عمل میں آئی اور غالب انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے پروفیسر قدوائی کی خدمت میں سپاس نامہ، شال، مومنٹو اور پچاس ہزار کا چیک پیش کیا گیا۔

انجمن ترقی اردو (دہلی شاخ) اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام یوم ذوق کا انعقاد 18 نومبر 2023

انجمن ترقی اردو (دہلی شاخ) اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام بہ اشتراک غالب اکیڈمی یوم ذوق کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر عقیل احمد نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ اپنے خطاب

میں انھوں نے کہا کہ ذوق ہماری کلاسیکی شاعری کا نمائندہ شاعر ہے۔ ان کے کلام کی تفہیم کے بغیر ہم اپنی ادبی روایت کو نہیں سمجھ سکتے۔ جلسے کی صدرات پروفیسر شریف حسین قاسمی نے فرمائی۔ صدارتی تقریر میں انہوں نے کہا کہ ذوق کو دلی کی زبان اور روزمرہ پر جو قدرت تھی اس کی مثال ان کے معاصرین کے یہاں کم ملتی ہے۔ ڈاکٹر خالد علوی نے اس موقع پر مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت فرمائی اور کہا کہ ذوق خوش قسمت تھے کہ انھیں محمد حسین آزاد جیسا شاگرد ملا لیکن محمد حسین آزاد نے ان کو جس حیثیت سے پیش کیا وہ تحقیق کی روشنی میں درست ثابت نہیں ہوتی۔ انجمن ترقی اردو (دہلی شاخ) کے صدر اقبال مسعود فاروقی نے استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ انجمن ترقی اردو (دہلی شاخ) ایک طویل عرصے سے یوم ذوق کا انعقاد کر رہی ہے یہ اردو کے اس عظیم شاعر کی خدمت میں خراج عقیدت ہے جس نے دہلی کی زبان اور محاوروں کو اپنی شاعری کے ذریعے رواج دیا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر اور انجمن ترقی اردو (دہلی شاخ) کے سیکرٹری ڈاکٹر ادریس احمد نے اظہار تشکر کرتے ہوئے کہا کہ آج کے جلسے میں جو حضرات موجود ہیں ایک عرصے سے یہ تمام افراد اس موقع پر تشریف لاتے ہیں اور ہر مرتبہ ذوق کے تعلق سے ایسی گفتگو کرتے ہیں جس سے میری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ میں تمام شرکا کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آج کے جلسے میں شریک ہو کر اسے کامیاب بنایا۔ انجمن ترقی اردو (دہلی شاخ کے جنرل سکریٹری خورشید عالم نے کہا کہ غالب اور اقبال کی شہرت تو بہت ہوئی لیکن ذوق پر کم گفتگو ہوتی ہے لہذا ہم کوشش کرتے ہیں کہ ذوق کو بھی وہی اہمیت دی جائے جس کے وہ مستحق تھے۔ افتتاحی اجلاس کے بعد ایک طرحی مشاعرے کا انعقاد ہوا جس کی صدارت جناب متین امروہوی نے اور نظامت جناب خواجہ طارق عثمانی نے فرمائی۔ حاضر شعرا نے اپنا اپنا کلام پیش کیا۔

غالب انسی ٹیوٹ کے زیر اہتمام چہار روزہ اردو ڈرامہ فیسٹیول کا انعقاد 19-22 نومبر 2023

غالب انسٹی ٹیوٹ کی ثقافتی تنظیم 'ہم سب ڈرامہ گروپ' کے زیر اہتمام 19 تا 22 نومبر 2023 کو اردو ڈرامہ فیسٹیول کا انعقاد ایوانِ غالب میں کیا گیا۔ اس جشنِ ڈرامہ کا افتتاح 19 نومبر کو شام چھے بجے غالب انسٹی ٹیوٹ کے چیئرمین اور سابق چیف جسٹس جموں اینڈ کشمیر جسٹس جناب بدر دُرریز احمد نے کیا۔ ڈاکٹر رخشندہ جلیل، چیئرپرسن ہم سب ڈرامہ گروپ، غالب انسٹی

ٹیوٹ اس افتتاحی تقریب میں شرکت کی۔ ڈاکٹر ادریس احمد، ڈائرکٹر، غالب انسٹی ٹیوٹ نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ افتتاحی تقریب کے بعد محترمہ فوزیہ داستان گو اور جناب رتیش یادو نے ریختی گوئی پیش کیا۔ 20 نومبر کو جناب جاوید صدیقی کا تحریر پر مبنی ڈرامہ ایک پرانا البم پیش کیا گیا جسے محترمہ لبنا اور جناب سلیم عارف نے ڈرامے کی شکل دی ہے۔ اس کے ہدایت کار جناب وکاس باہری ہیں۔ 21 نومبر کو 'قصے بازی' جس کو جناب دانش حسین پیش کی۔ فیسٹیول کے آخری دن 'مجاز زندہ ہے' پیش کیا گیا جس کی تحریر و ہدایت محترمہ سلیمہ رضا نے کی۔ اردو ڈرامہ فیسٹیول غالب انسٹی ٹیوٹ کی اہم سرگرمیوں میں شمار ہوتا ہے اس چہار روزہ اردو ڈرامہ فیسٹیول میں کثیر تعداد میں شائقین نے شرکت کی۔

"Accession Number"
.....21156.....

Shashmahi

Ghalibnama

NEW DELHI

"Gifted"

Registration No. DELURD/2018/75372

ISSN : 2582-5658

January to June 2023 VOLUME : 7 No. 1

Price : Rs. 250/-

Printer & Publisher:

Dr. IDRIS AHMAD

"Accession Number" 21156

Computer Composer:

MOHD. UMAR KAIRANVI

Printed by:

AZIZ PRINTING PRESS

Printed and published by Dr. Idris Ahmad on behalf of the Ghalib Institute, Aiwan-e-Ghalib Marg, New Delhi 11002 and printed at the Aziz Printing Press,

Katra Mehar Parwar, Kucha Chellan, Daryaganj, New Delhi 110002.

Editor: Dr. Idris Ahmad, email: ghalibinstitute@gmail.com

Ph. : 23232583-23236518

"Fakhruddin Ali Ahmed Research Library
Ghalib Institute, Aiwan-e-Ghalib Marg,
New Delhi-110002

GHALIB NAMA

Aiwan-e-Ghalib, Aiwan-e-Ghalib Marg
(Mata Sundri Lane), New Delhi-110002
Ph. : 42448492

Ghalibnama

Chief Editor :

Prof. Sadiq-Ur-Rahman Kidwai

Editor:

Dr. Idris Ahmad

Assistant Editor:

Dr. Mahzar Raza

GHALIB INSTITUTE

AIWAN-E-GHALIB MARG (MATA SUNDRI LANE)

NEW DELHI:110002

ISSN : 2582-5658
Registration. No. DELURD/2018/75372

Shashmahi

Ghalibnama

(Half Yearly Referred and Research Urdu Journal Approved by UGC)

Ghalib Institute, Aiwan-e-Ghalib Marg, Mata Sundri Lane,
New Delhi 110002

January to June, 2024, Vol. 7, No. 1

مَیں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہُوں

Printed and published by Dr. Idris Ahmad on behalf of the Ghalib Institute, Aiwan-e-Ghalib Marg, (Mata Sundri Lane), New Delhi 110002 and printed at the Aziz Printing Press, 2119, Katra Mehar Parwar, Kucha Chellan, Daryaganj, New Delhi 110002.
Editor: Dr. Idris Ahmad, email: ghalibinstitute@gmail.com
Ph. : 23232583-23236518